تدبر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

پیکر مطبوعات

ادارہ تدبر قرآن و حدیث

لاہور، پاکستان

سلسلہ ۱۹ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ نومبر ۱۹۸۶ء

تدبّر

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

متحدہ شریعت محاذ کا مجوزہ شریعت بل ——— خالد مسعود ۳

روایتِ افک ——— خالد مسعود ۵

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۂ نساء (۲) ——— خالد مسعود ۸

تزکیۂ نفس

آدمی کا تعلق ریاست سے ——— امین احسن اصلاحی ۱۸

افاداتِ فراہی

مولانا فراہیؒ کے قلمی حواشی
الاتقان فی علوم القرآن پر (۲) ——— ۲۸

مراسلہ و مذاکرہ

اسلامی ارسٹوکریسی ——— امین احسن اصلاحی/ماجد خاور ۳۶

مجلسِ ترتیب :

- خالد مسعود (مدیر)
- عبد اللہ غلام احمد
- ماجد خاور
- محبوب سبحانی

ناشر : ادارہ تدبر قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور - ۲۵
مطبع : المطبعة العربية - لاہور
قیمت : ۴/= روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

خالد مسعود

متحدہ شریعت محاذ کا مجوزہ شریعت بل

عرصہ سے پرائیویٹ شریعت بل ہمارے ملک میں زیرِ بحث ہے۔ پارلیمنٹ میں تو اس کا چرچا ہونا ہی چاہیے تھا لیکن اس بل نے مذہبی سیاسی جماعتوں ہی کو نہیں بلکہ ان تنظیموں کو بھی متحرک کر دیا ہے جو ملک میں نفاذِ شریعت کے باب میں کوئی مثبت یا منفی خیالات رکھتی ہیں۔ شیعوں نے جس طرح زکوٰۃ کے نفاذ کے معاملہ میں اپنے فرقہ کو مستثنیٰ قرار دلوا لیا تھا، اب نفاذِ شریعت کی اس کوشش کو بھی وہ اپنے لیے نقصان دہ سمجھ کر اس کی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ اہلِ سنت کے بعض گروہ اس کے خلاف سرگرمِ عمل ہیں۔ اہلِ حدیث اس میں اپنے مسلک پر احناف کی بالادستی محسوس کرتے ہیں اس لیے ان کی ہمدردیاں تقسیم نظر آتی ہیں۔ جہاں تک شریعت بل کے مصنفین و مویدین کا تعلق ہے وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس بل کے پاس ہوتے ہی ملک میں ہر طرف احکامِ شریعت کا دور دورہ ہوگا۔ نفاذِ شریعت میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو بس یہ کہ شریعت بل کو حکومت نے ابھی تک منظور نہیں کروایا۔ بل کی منظوری کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی خاطر متحدہ شریعت محاذ تشکیل دیا گیا ہے۔ اس محاذ نے بل کو مختلف فرقوں کے لیے قابلِ قبول بنانے کے لیے اس کی بعض دفعات میں ترمیم کی ہے اور اب اس کی حمایت میں ملک گیر تحریک شروع کرنے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

جہاں تک اس خواہش کا تعلق ہے کہ ملک میں شریعت نافذ ہو، یہ ہر مخلص مسلمان کے ایمان کا تقاضا ہے۔ دین پر کاربند لوگوں میں اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ نفاذِ شریعت سے اگر وحشت ہوتی ہے تو انہی لوگوں کو ہوتی ہے جو معاشرہ کو مغربی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں اور اسلام سے ان کو فی الحقیقت نفرت ہے اگرچہ وہ اس کا برملا اظہار نہ کر سکیں۔ اسی طرح اس سے اگر بے تعلق ہیں تو وہی لوگ جو دین سے بے بہرہ اور ہر نحوہ باز کا ساتھ دینے والے ہیں۔ انہیں دین کے اس حصے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں جس پر وہ شریعت بل کی منظوری کے بغیر بھی عمل کر سکتے ہیں لہٰذا یہ بل ان کے مقاصدِ حیات سے ہم آہنگ نہیں۔ اہلِ دین کی بہرحال یہ ذمہ داری ہے کہ

وہ ہر ممکن طریقہ بروئے کار لائیں جس سے ملک میں شریعت کا نفاذ ممکن ہو سکے۔

مجوزہ شریعت بل میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مختلف فرقوں کے لیے اس کی دفعات کو قابلِ قبول بنایا جائے لہٰذا اس کے آخری مسودہ میں شریعت سے مراد قرآن اور سنت کو لیا گیا ہے اور کسی فقہی مسلک یا اس کے اصولِ اجتہاد کو اس کے مفہوم میں شامل نہیں کیا گیا۔ البتہ دفعہ میں یہ وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے کہ مسلّمہ اسلامی فرقوں کے شخصی معاملات ان کے اپنے فقہی مسالک کے مطابق طے کیے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بل کے مصنفین شریعت کی وحدت کو قائم کرنے کے لیے اپنے فقہی اختلافات کی قربانی نہیں دینا چاہتے۔ اس مسودہ پر کسی شیعہ کے دستخط نہیں جس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے جو شاید درست بھی ہے کہ زکوٰۃ کے معاملے کی طرح وہ سوادِ امت سے اپنے آپ کو بیگانہ رکھیں گے۔ لہٰذا اہلِ سنت کا اپنے اپنے فقہی مسالک پر بچے رہنا اور انہی کو صحیح سمجھنا جبکہ اہلِ سنت کے تمام فقہاء کی فقہیں شریعتِ اسلامیہ پر مبنی ہیں، یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ شریعت کے ایک حصہ سے صرفِ نظر کر رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک اہلِ سنت کی تمام فقہیں صحیح بنیادوں پر تعمیر ہوئی ہیں اور ان سب سے استفادہ کرنا امت کی مصلحت میں ہے۔ تمام فرقوں کے علمائے کرام اپنے ذہنوں میں جب تک یہ وسعت نہ پیدا کریں گے کہ وہ دوسری فقہوں کو بھی اپنا ہی سرمایۂ دینی سمجھیں، ہمیں اندیشہ ہے کہ اس وقت تک نفاذِ شریعت کی جدوجہد کامیاب نہ ہو سکے گی۔ فرض کیجیے کہ بل کے لفظوں پر اجماع کر بھی لیا گیا تو عمل میں آنے کے بعد اتحاد و اتفاق کی یہ فضا کس طرح برقرار رہ سکے گی جبکہ دلوں میں بُعد باقی رہا۔ اس معاملے میں عوام کو ایک مسلک پر بچے ہونے کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ان کے دینی رہنما وسعتِ نظر پیدا کر لیں گے تو یہ وسعتِ نظر ان عوام میں بھی از خود پیدا ہو جائے گی۔

احکامِ شریعت کی تعبیر کے لیے سنتِ خلفائے راشدین، تعاملِ اہلِ بیت و صحابہ کرامؓ، اجماعِ امت اور مسلّمہ فقہائے اسلام کی تشریحات کو رہنما بتایا گیا ہے لیکن بل اس بارے میں خاموش ہے کہ ان سے رہنمائی کون حاصل کرے گا اور پیش آنے والے مسائل میں اجتہاد کا حق کسے دیا گیا ہے۔ اگر تو مجتہدینِ کرام کا کوئی بورڈ یہ اجتہاد کرے گا تو اس کا ذکر بل کی کسی دفعہ میں نہیں ہوا۔ اس کے برعکس دفعہ ۳ میں تمام عدالتوں کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ شریعت کے مطابق فیصلہ کریں گی۔ اس سے ذہن اس طرح جاتا ہے کہ شاید اجتہاد کا حق بل کے مصنفین ججوں اور مجسٹریٹوں کو دے رہے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو اس بل سے نفاذِ شریعت کا مقصدِ عزیز بالکل حاصل نہ ہو سکے گا۔ ہمارے جج، مجسٹریٹ اور وکلاء کی تربیت جس طور پر ہوئی ہے وہ رومن لاء کو نافذ کرنے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن اسلامی شریعت ان کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ نہ انہیں اس کے مصادر تک رسائی حاصل ہے اور نہ اجتہاد کا طریق کار ان پر واضح ہے۔ دوسری مشکل ان کے لیے یہ ہے کہ اگرچہ رومن لاء ان کے پاس مدوّن صورت میں موجود ہے اور اس کے مطابق فیصلے کرتے ہوئے ان کی زندگیاں گزری ہیں لیکن ان کی عدالتوں میں ہزاروں مقدمات

فیصلہ طلب جمع ہو گئے ہیں اور کتنے ایسے مقدمات ہیں جن کے فریق بھی اس دنیا سے جا چکے لیکن عدالتیں کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکیں۔ شریعت کا معاملہ یہ ہے کہ یہ مدوّن کر کے نفاذ کے لیے ان کے حوالے نہیں کی جا رہی ہے بلکہ ان سے شاید یہ توقع کی جا رہی ہے کہ وہ احکام کا استخراج خود کریں۔ اس صورت میں فیصلوں میں تاخیر جو اثرات معاشرہ پر مترتب کرے گی ان کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ بل میں ایکٹ کے مقاصد کے حصول کے لیے مرکزی حکومت کو قواعد سازی کا اختیار دیا گیا ہے لہٰذا حکومت قانون کی تدوین کرانے کی ذمہ دار ہوگی۔ ہمارا خیال ہے کہ جس طرح قراردادِ مقاصد کو اب چھتیس برس بعد دستورِ پاکستان میں شامل کیا گیا ہے اسی طرح اس ایکٹ کے نفاذ میں کم از کم مزید نصف صدی ابھی حائل ہے۔ اس سے پہلے توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ قواعد سازی کا ہفت خوان طے ہو سکے گا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی رفتارِ کار اور حکومت کا اس کی سفارشات کے بارے میں رویہ اس بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

بعض اہلِ علم کی جانب سے یہ تجویز سامنے آئی ہے کہ قانونِ اسلامی کی تدوین کے ضمن میں اگر علمائے کرام فرقہ بندی سے بالاتر ہو کر ترکی کے مجلۃ الاحکام العدلیہ کی روشنی میں ایک مجموعۂ قانون مرتب کر سکیں تو یہ کوشش نفاذِ اسلام کی منزل کو قریب تر لانے کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس طرح کا ضروری قوانین پر مشتمل مجموعۂ قانون نہایت قلیل مدت میں رومن کوڈ کی جگہ لے سکتا ہے اور اس میں بعد میں اضافے کیے جا سکتے ہیں۔ متحدہ شریعت محاذ کو اس طرح کا بنیادی کام کرنے کی کوئی صورت پیدا کرنی چاہیے۔ اگر اس مجموعۂ قوانین پر مختلف مسالک کے علماء کا اتفاق ہو سکے تو پھر حکومت بھی اس کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہو جائے گی۔

روایتِ افک

تدبر کی گذشتہ اشاعت (سلسلہ نمبر ۱۸، جولائی ۱۹۸۶ء) میں ہم نے حکیم نیاز احمد صاحب کی تصنیف 'روایتِ افک' کا تعارف کراتے ہوئے ان کے ان دلائل کا خلاصہ پیش کیا تھا جن کی بنا پر وہ افک کے واقعہ کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نسبت کو غلط مانتے ہیں۔ حال ہی میں جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، ضلع اعظم گڑھ (انڈیا) سے ہمیں مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی، شیخ الحدیث جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ کی تفسیر سورۂ نور موصول ہوئی ہے جس میں فاضل مصنف نے آیاتِ افک کے ذیل میں روایاتِ افک پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ داستان شیعوں نے سیدہ عائشہ صدیقہؓ کو مطعون کرنے کے لیے گھڑی ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سورۂ نور کی آیاتِ افک میں منافقین کی پھیلائی ہوئی ان تہمتوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ کو خراب کرنے کے لیے پھیلایا کرتے تھے۔

فاضل مصنف کے بیشتر دلائل حکیم نیاز احمد صاحب کے دلائل سے ملتے ہیں اس لیے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ بعض پہلو قارئین کے لیے افادہ کا باعث ہوں گے اس لیے صرف ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے :

ا ۔ فاضل مصنف کی تحقیق میں روایت زہری، روایت ابواسامہ اور روایت ام رومانؓ تینوں منقطع اور مرسل روایتیں ہیں جن کا آپس میں متعدد پہلوؤں میں اختلاف ہے۔ زہری کی روایت 'راوی معلوم مروی مجہول' کے قبیل کی ہے۔

ب ۔ آیاتِ افک کے نزول کے موقع کی تین روایتوں میں الگ الگ تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اس اختلاف کی توجیہہ ممکن نہیں اس لیے تینوں روایتیں قابلِ رد ہیں۔

ج ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسامہؓ اور بریرہؓ سے گواہی لینا منسوب کیا گیا ہے جبکہ اس وقت اسامہؓ کے والد حضرت زیدؓ بھی زندہ تھے۔ گواہی کے لیے ایک بچے کے بجائے وہ زیادہ موزوں تھے۔ بریرہؓ فتح مکہ کے بعد حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں۔ ان کی گواہی تین سال پہلے کے واقعہ میں کیسے لی جا سکتی تھی ؟

د ۔ یہ تصور محال ہے کہ حضرت عائشہ کا قافلے سے بچھڑ جانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں دوپہر کے پڑاؤ تک بھی نہ آسکا، حالانکہ معمولاً ام المومنین کا اونٹ سفر میں آپ کے اونٹ کے ساتھ ہوتا اور آپ باتیں کرتے ہوئے چلتے۔ دورانِ سفر نماز فجر کے لیے قافلہ رکا۔ اس وقت یہ کیوں معلوم نہ ہو سکا کہ ام المومنینؓ پیچھے رہ گئی ہیں۔ نیز جب وہ آملیں تو کسی روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ سے کوئی پوچھ گچھ ہوئی یا نہ ہوئی۔ آخر ایک ماہ بعد اس واقعہ کی جستجو کیوں ہوئی ؟

ہ ۔ یہ واقعہ شعبان میں پیش آیا تھا۔ ایک ماہ بعد گویا رمضان میں یہ تحقیقات ہوئی۔ ہر رمضان میں جبرئیل امینؑ قرآن مجید کا مذاکرہ کرتے۔ آخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مہینہ بھر وحی کا انتظار کیوں رہا، آپ نے جبرئیل امین ہی سے کیوں دریافت نہ کر لیا۔ نیز انتظار کاہے کا تھا۔ تہمت کے احکام تو پہلے سے نازل ہو چکے تھے آپ نے ان کے مطابق کیوں عمل نہ فرمایا ؟

و ۔ ایسا واقعہ اگر پیش آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے انتہائی رنج والم کا باعث ہوتا۔ اس رنج و کرب کے زمانہ میں حضرت جویریہؓ سے آپ نے شادی کیسے کر لی ؟

فاضل مصنف نے زہری کو اس افسانہ کا مصنف قرار نہیں دیا، بلکہ یہ کہا ہے کہ انہوں نے سنی سنائی باتیں روایت کر دیں اور امام بخاریؒ نے یہ تحقیق کیے بغیر کہ یہ مرسل روایتیں ہیں ان کو اپنی کتاب میں جگہ دے دی۔ ہمارے نزدیک اس معاملے میں حکیم صاحب کی تحقیق کے شواہد زیادہ موجود ہیں۔ فاضل مصنف کے نزدیک روایت میں حمنہ بنت جحشؓ اور حسان بن ثابتؓ کو جو واقعہ افک کے پھیلانے کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے تو یہ بھی شیعوں

کی خباثت اور ان صحابہ سے نفرت کے باعث ہے۔ حضرت حسانؓ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی بلکہ مدینہ چھوڑ کر حضرت معاویہؓ کے پاس شام چلے گئے تھے۔ حمنہؓ حضرت طلحہؓ کی زوجیت میں تھیں اور شیعہ طلحہؓ کو حضرت علیؓ کا مخالف اور جنگ جمل میں شریک قرار دیتے ہیں اس لیے ان کی زوجہ کو مطعون کرنے کا انہوں نے روایت افک میں ایک بہانہ پیدا کیا ہے۔

میرٹھی صاحب اور حکیم صاحب کی تحقیقات اصل مسئلہ کے بارے میں کلی طور پر متفق ہیں اور ان کا یہ مستفاد نہایت خوش آئند اور صحابہ کرامؓ کے دامن کو شیعوں کے اڑائے ہوئے چھینٹوں سے پاک کرنے والا ہے۔

میرٹھی صاحب کی تفسیر کے چند اجزاء سورتوں کی شکل میں مکتبہ ازہریہ، رائے دھنہ براہ کھتولی، ضلع میرٹھ (انڈیا) نے شائع کیے ہیں۔

بقیہ : تفسیر سورہ نساء (۲)

قتل کرے گا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت[۴۲] ہے اور اللہ نے اس کے لیے ایک عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے ﴿۹۳﴾

---

۴۲ قتل عمد کے جرم کی سنگینی کی علت یہ ہے کہ قاتل نے حقوق العباد میں سے سب سے بڑے حق کو تلف کیا جس کی تلافی و اصلاح کی اب کوئی شکل باقی نہ رہی کیونکہ مقتول دنیا سے رخصت ہو چکا اور حقوق العباد کی اصلاح کے لیے تلافی مافات ناگزیر ہوتی ہے۔ نیز ایک مسلمان کو اپنے دین اور اپنے نفس کے معاملے میں اگر کسی سے خیر کی امید ہو سکتی ہے تو وہ مسلمانوں ہی سے ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان ہی اس کو عمداً قتل کر دے تو اس سے بڑھ کر ظالم قاتل کون ہوگا!

متدبرِ قرآن
خالد مسعود

تفسیر سورہ نساء (۲)

اے ایمان والو نشے کے حال میں نماز کے پاس نہ جایا کرو یہاں تک کہ جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو اس کو سمجھنے لگو اور جنابت کی حالت میں، مگر یہ کہ بس گزر جانا پیش نظر ہو، یہاں تک کہ غسل کر لو۔ اور اگر تم مریض ہو، یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے یا عورتوں سے ہم صحبت ہوا ہو، پھر پانی نہ میسر آئے تو کوئی پاک جگہ دیکھو اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح[۴۰] کر لو۔ بے شک اللہ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے ۝ ۴۳

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتابِ الٰہی کا ایک[۴۰] حصہ ملا۔ وہ گمراہی کو ترجیح دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ کھو بیٹھو ۝ اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے اور اللہ کافی ہے حمایت کے لیے اور اللہ کافی ہے مدد کے لیے ۝ ۴۵

یہود میں سے ایک گروہ زبان کو توڑ مروڑ کر اور دین پر طعن کرتے ہوئے الفاظ کو ان کے موقع و محل سے ہٹا

---

۳۹ آیت میں لفظ صلوٰۃ سے نماز اور موضع نماز یعنی مسجد دونوں مراد ہیں۔ آیت اس زمانے میں نازل ہوئی جب شراب کی قطعی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ جس طرح شراب کا نشہ مبطلِ نماز ہے اسی طرح جنابت کا کسل اور انقباض بھی اس انشراح اور حضورِ قلب کے منافی ہے جو نماز کے لیے مطلوب ہے۔ مرض، سفر یا پانی کی نایابی کی تین حالتوں میں ہر قسم کی نجاست سے طہارت حاصل کرنے کے لیے تیمم کی اجازت دی ہے۔

۴۰ اوپر اصلاحِ معاشرہ سے متعلق احکام بیان ہوئے۔ آگے ردعمل کا بیان ہے جو ان اصلاحات کے مخالفین کی طرف سے ظاہر ہوا۔ ان مخالفین میں یہود پیش پیش تھے اس لیے ان پر خاص طور پر گرفت کی ہے اور ان کو براہِ راست خطاب کر کے دھمکی دی ہے۔ کتابِ الٰہی کا ایک حصہ پانے والی قوم یہود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے آسمانی صحیفوں اور قرآنِ عظیم میں نسبت جزو اور کل کی ہے۔

دیتا ہے اور سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا، اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا کہتا[۴۱] ہے اور اگر وہ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، اِسْمَعْ اور اُنْظُرْنَا کہتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا اور بات برمحل ہوتی لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے اس وجہ سے وہ شاذ ہی ایمان لائیں گے ۝ ۴۶

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے، ان پیشین گوئیوں کے مطابق جو خود تمہارے پاس موجود ہیں، قبل اس کے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو ان کے پیچھے کی جانب الٹ دیں یا ان پر بھی اسی طرح لعنت کر دیں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت[۴۲] کر دی اور خدا کی بات شدنی ہے ۝ ۴۷

اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے اس کو جس کے لیے چاہے گا بخش دے[۴۳] گا۔ اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے وہ ایک بہت بڑے گناہ کا افترا کرتا ہے ۝ ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے ہیں! بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا ۝ دیکھو، یہ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھ رہے ہیں اور صریح گناہ ہونے کے لیے تو یہی کافی ہے ۝ ۵۰

ذرا ان کو دیکھو جنہیں کتابِ الٰہی کا ایک حصہ ملا۔ یہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو یہ ہیں ۝ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو تم ان کا کوئی مددگار نہیں[۴۴] پا سکتے ۝ کیا خدا کے اقتدار میں کچھ ان کا بھی دخل ہے کہ یہ لوگوں

---

۴۱ یہ الفاظ عرب کے مجلسی الفاظ میں سے تھے جو متکلم کی تحسین و قدر افزائی، سامع کے اظہارِ ذوق و شوق اور مخاطب کے اعتراف و قبول پر دلیل ہوتے تھے۔ یہودی اشرار لب و لہجہ میں ذرا مصنوعی انداز پیدا کر کے یا تلفظ کو بگاڑ کر ان الفاظ کی تحسین کو تقبیح اور اعتراف و اقرار کو طنز و استہزا بناتے اور اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی نگاہوں سے گرانے اور اسلام کو بے وزن اور حقیر بنانے کی کوشش کرتے۔ قرآن نے ان الفاظ ہی کو مسلمانوں کے مجلسی الفاظ سے خارج کر دیا۔

۴۲ رحمت کی طرح لعنت اور نقمت کے بھی مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ یہاں یہود کو جس درجے کی لعنت کی دھمکی دی گئی ہے یہ وہ لعنت ہے جس کے فی الواقع وہ اپنی شرارتوں کی وجہ سے مستحق بن چکے تھے۔

۴۳ سارے دین کے قیام و بقا کا انحصار توحید پر ہے۔ جو لوگ ہر پہلو سے اس کی حفاظت کرتے ہیں وہی اپنی دوسری کوتاہیوں کے باوجود اپنے اصل دین کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ توحید میں رخنہ پیدا کرتے ہیں وہ اصل دین کو ہدم کر دیتے ہیں چنانچہ ان کے دوسرے کام بھی، جو بظاہر دینداری کے ہوں، بالکل بے سود ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا۔

۴۴ ان آیات میں یہود کے بعض مشرکانہ اعمال و عقائد پر ان کو سرزنش کی ہے۔ ایک یہ کہ ان کو تقدس اور برتری کا ادعا

کو کچھ بھی دینے کو تیار نہیں ۵ کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں اس فضل پر جو اللہ نے ان کو بخشا؟ تو ہم نے تو بخش دی آلِ ابراہیم[۴۵] کو کتاب و حکمت اور ہم نے ان کو ایک عظیم سلطنت بھی بخشی ۵ ۵۴

پس ان میں سے ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لائے اور ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس سے منہ موڑا[۴۶]۔ ایسوں کے لیے جہنم کی بھڑکتی آگ ہی کافی ہے ۵ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا ہم ان کو ایک سخت آگ میں جھونک دیں گے۔ جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ یہ عذاب کا مزا خوب چکھیں۔ بے شک اللہ عزیز و حکیم ہے ۵ اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس میں ان کے لیے پاک بیویاں ہوں گی اور ہم ان کو گھنی چھاؤں میں رکھیں گے ۵ ۵۷

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو۔ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو[۴۷]۔ خوب بات ہے یہ جس کی اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے ۵ ۵۸

ہے۔ اس زعمِ باطل نے ان کو ایمان و عمل کی ذمہ داریوں سے بے فکر کر دیا ہے اور انہوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال کر الوہیت کے دائرے میں شامل کر رکھا ہے۔ دوسرے یہ جبت یعنی اعمالِ سفلیہ مثلاً سحر، شعبدہ، ٹونے ٹوٹکے، رمل، جفر، فال گیری، نجوم وغیرہ، طاغوت یعنی شیطانی قوتوں اور ارواحِ خبیثہ پر ایمان رکھتے ہیں اور دین و شریعت کو پس پشت ڈالتے ہیں۔ تیسرے اہلِ ایمان کے مقابل میں کفار و مشرکین کی حمایت کرتے اور ان کو مسلمانوں سے زیادہ حق و ہدایت پر سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی لعنت کے مستحق ہیں۔

[۴۵] آلِ ابراہیم سے یہاں مراد بنی اسماعیل ہیں کیونکہ بنی اسرائیل پر لعنت کے بعد یہ فیصلہ فرمایا جا رہا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اگر بنی اسماعیل پر حسد کی آگ میں یہود جل رہے ہیں تو جلتے رہیں، ہم نے تو ان کو کتاب و حکمت بھی عطا کر دی اور ایک عظیم سلطنت بھی بخش دی۔

[۴۶] یہ آیات بنی اسماعیل سے متعلق ہیں۔ فرمایا کہ ان میں سے ایک گروہ تو کتاب و حکمت کو قبول کر کے ایمان سے مشرف ہو چکا ہے لیکن ایک گروہ ابھی اس سے روگرداں ہے۔ بنی اسماعیل اس حقیقت سے آگاہ رہیں کہ اللہ کا یہ فضل مجرد خاندان و نسب کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان میں سے وہی لوگ اس انعامِ الٰہی میں حصہ دار ہوں گے جو اس قرآن اور نبی پر ایمان لائیں گے۔

[۴۷] یہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان کو نصیحت کی ہے کہ شریعتِ الٰہی کی یہ امانت یہود سے چھین کر اب تمہارے حوالے

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے اولوالامر کی[۴۸]۔ پس اگر کسی امر میں اختلافِ رائے واقع ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو[۴۹]۔ یہ طریقہ بہتر اور باعتبارِ مآل اچھا ہے ۵ ۵۹

ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے لیکن چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصلہ کے لیے طاغوت[۵۰] کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں اس کے انکار کا حکم دیا گیا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ انہیں نہایت دور کی گمراہی میں ڈال دے ۵ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول کی طرف آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ تم سے کترا جاتے ہیں ۵ اس وقت کیا ہوگا جب ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو کوئی مصیبت پہنچے گی، پھر یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ خدا کی قسم ہم نے تو صرف بہتری اور سازگاری[۵۱] چاہی ۵ ان لوگوں کے دلوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے تو ان سے اعراض کرو، ان کو سمجھاؤ اور ان سے

کی جا رہی ہے تو تم تمام حقوق و فرائض، خواہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہوں یا حقوق العباد سے، انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے، صلح و امن کے دور کے ہوں یا جنگ کے، ٹھیک ٹھیک ادا کرنا اور ہمیشہ اپنے فیصلوں میں عدل کو ملحوظ رکھنا جو ایک صاحبِ اقتدار کی اولین ذمہ داری ہے۔

[۴۸] اولوالامر سے مراد اسلامی معاشرے کے اربابِ حل و عقد، ذمہ دار اور سربراہ کار ہیں۔ معاشرے کے حالات کے لحاظ سے اس کے مصداق اربابِ علم و بصیرت بھی ہو سکتے ہیں اور اربابِ اقتدار و سیاست بھی۔ اسلام کے سیاسی نظام میں اولوالامر بھی امر و طاعت کا مرکز ہیں لیکن ان کی اطاعت اللہ و رسولؐ کی اطاعت کے تحت ہے۔

[۴۹] مراد وہ اختلافِ رائے ہے جو کسی معاملے میں حکمِ شریعت معین کرنے کے باب میں ہو سکتا ہے۔ امت کے اربابِ حل و عقد کو اس صورت میں یہ ہدایت دی کہ وہ کتاب و سنت کی طرف رجوع کریں اور جو بات اس سے اوفق نظر آئے، اس کو اختیار کریں۔ قانونِ اسلامی کے مرجع کی حیثیت سے کتاب اللہ کی طرح سنتِ رسول کی حیثیت بھی مستقل اور دائمی ہے۔ اولوالامر قانون کے مرجع کی حیثیت سے دین میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے۔

[۵۰] یہاں طاغوت سے مراد یہود کے سردار اور لیڈر ہیں۔ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے بچنا چاہتے وہ اپنے معاملات فیصلہ کے لیے ان کے پاس لے جاتے۔

[۵۱] جس مصیبت کے پیش آنے کا یہاں ذکر ہے وہ بعد میں اس طرح پیش آئی کہ جب اسلام نے طاقت پکڑ لی اور یہود کی سیاسی طاقت کمزور ہو گئی تو مسلمانوں کو منافقین کے معاملے میں چشم پوشی اور اغماض کی روش بدلنے کا حکم دے دیا گیا۔ جب منافقین کا قدم قدم پر احتساب شروع ہوا تو یہ اپنی منافقت کو مصالحت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔

خود ان کے باب میں دل میں دھنسنے والی بات کہو ۝ ۶۳

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے[۵۲]۔ اور اگر وہ جب کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا، تمہاری خدمت میں حاضر ہوتے اور خدا سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو وہ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے ۝ پس نہیں، تیرے رب کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تمہیں کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کر دیں ۝ اور اگر ہم ان پر یہ فرض کرتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو یا اپنے گھروں کو چھوڑو تو ان میں سے بس تھوڑے ہی اس کی تعمیل کرتے[۵۳]۔ اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جس کی ہدایت کی جاتی تو ان کے لیے یہ بات بہتر اور ایمان پر قدم جمانے والی ہوتی ۝ اس وقت ہم انہیں اپنے پاس سے بڑا اجر دیتے ۝ اور انہیں صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشتے ۝ ۶۸

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے وہی ہیں جو انبیاء، صدیقین اور شہداء و صالحین کے اس گروہ کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور کیا ہی اچھے ہیں یہ رفیق ۝ یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے اور اللہ کا علم کفایت کرتا ہے ۝ ۷۰

اے ایمان والو، اپنے اسلحہ سنبھالو اور جہاد کے لیے نکلو، ٹکڑیوں کی شکل میں یا جماعتی شکل میں[۵۴] ۝ اور تم میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ پس اگر تم کو کوئی گزند پہنچ جائے تو کہتے ہیں کہ مجھ پر اللہ نے فضل

---

۵۲ رسول صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں بلکہ اطاعت کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ اس کی اطاعت بالواسطہ خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔ وہ خدا کی قانونی و تشریعی حاکمیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس لیے کسی صاحبِ ایمان کے لیے اس امر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ رسول کی عدالت کو چھوڑ کر اپنے کسی معاملے کو فیصلے کے لیے طاغوت کی عدالت میں لے جائے۔

۵۳ منافقین اگرچہ اسلام کے مدعی بن بیٹھے تھے لیکن یہ ابھی جاہلیت کے سابق روابط کے پھندوں سے پوری طرح آزاد نہ ہوئے تھے۔ قرآن نے یہ ان کی اسی کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کو اپنوں سے لڑنے اور اپنے گھر بار چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ آ ملنے کا حکم دیا جائے تو اس جہاد اور ہجرت کے لیے ان میں سے بہت تھوڑے آمادہ ہوں گے۔ تلوار جب ان کے خلاف اٹھانی پڑے جن سے خون اور قرابت کے رشتے ہوں تو اس صورت میں گویا یہ اپنی ہی گردن پر چلانی پڑتی ہے۔ اسی حقیقت کو تعبیر کرنے کے لیے فرمایا کہ اپنے آپ کو قتل کرو۔

۵۴ یہ مسلمانوں کو من حیث الجماعت خطاب کر کے مسلح ہونے اور جنگ کے لیے اٹھنے کا حکم دیا ہے۔ عرب میں جنگ کے دو طریقے معروف تھے۔ ایک منظم فوج کی شکل میں لشکر آرائی، دوسرا طریقہ جو گوریلا جنگ میں اختیار کیا جاتا ہے۔

کیا کہ میں ان کے ساتھ شریک نہ ہوا ۝ اور اگر تمہیں اللہ کا کوئی فضل حاصل ہو تو، اس طرح کہ گویا تمہارے اور ان کے درمیان کوئی رشتہ محبت ہے ہی نہیں[۵۵]، کہتے ہیں کہ اے کاش! میں بھی ان کے ساتھ ہوتا کہ ایک بڑی کامیابی حاصل کرتا ۝ پس چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے وہ لوگ اٹھیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے لیے تج چکے ہیں[۵۶] اور جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے گا تو خواہ مارا جائے یا غالب ہو ہم اس کو اجرِ عظیم دیں گے ۝ ۷۴

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے جنگ نہیں کرتے جو دعا کر رہے ہیں کہ اے میرے پروردگار! ہمیں اس ظالم باشندوں کی بستی سے نکال[۵۷] اور ہمارے لیے اپنے پاس سے ہمدرد پیدا کر اور ہمارے لیے اپنے پاس سے مددگار کھڑے کر ۝ ۷۵

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے کفر کیا وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے حامیوں سے لڑو، شیطان کی چال تو بالکل بودی ہوتی ہے[۵۸] ۝ ۷۶

یعنی ٹکڑیوں اور دستوں کی صورت میں دشمن پر چھاپہ مارنا۔ ان دونوں طریقوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا اور تاریخ سے معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوات میں منظم فوج کشی بھی فرمائی اور وقتاً فوقتاً سریے بھی بھیجے۔

۵۵ یہ الفاظ منافقین کے باطن پر عکس ڈال رہے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی کامیابی کو اپنی کامیابی نہیں بلکہ حریف کی کامیابی سمجھتے ہیں اور اپنی محرومی پر سر پیٹتے ہیں کہ وہ فوائد میں حصہ دار نہ ہو سکے۔ گویا اسلام اور مسلمانوں سے ان کا کوئی رشتہ ہی نہیں۔

۵۶ یعنی منافقین تو صرف اس جنگ کے غازی بننا چاہتے ہیں جس میں ان کی نکسیر بھی نہ پھوٹے اور مالِ غنیمت بھی بھرپور ہاتھ آئے۔ خدا کے دین کو ایسے نام نہاد غازیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کی راہ میں جہاد کے لیے وہ مردانِ کار اٹھیں جو آخرت کے لیے اپنی دنیا تج چکے ہوں۔

۵۷ جہاد پر ابھارنے کے لیے یہ اس ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس وقت اس کی داعی تھی۔ وہ ضرورت یہ تھی کہ جگہ جگہ مسلمان مرد، عورتیں اور بچے کفار کے نرغے میں گھرے ہوئے، اسلام لانے کے جرم میں ان کے ہاتھوں طرح طرح کے مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے اور ان کے پنجۂ ستم سے نجات حاصل کرنے کے لیے فریادیں کر رہے تھے۔ اسلامی جہاد کا اصل مقصد دنیا سے فتنہ کو مٹانا ہے۔ اگر کہیں مسلمان اس طرح کی مظلومیت کی حالت میں گھر جائیں کہ ظالم کفار نے ان پر خود ان کے وطن کی زمین تنگ کر دی ہو اور ان کے دین و ایمان کو اس میں امن حاصل نہ ہو تو ان تمام مسلمانوں پر جو ان کی مدد کی پوزیشن میں ہوں جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ان کی مدد کے لیے نہ اٹھیں تو یہ صریح نفاق ہے۔

۵۸ مسلمانوں کا جہاد اللہ کی راہ میں اور کفار کی جنگ شیطان کی راہ میں ہوتی ہے۔ اس لیے مقابلہ اصلاً رحمان اور شیطان

تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو تو جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح اللہ سے ڈرا جاتا ہے، یا اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب، تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی، کچھ اور مہلت کیوں نہ دی[89]۔ کہہ دو اس دنیا کی متاع بہت قلیل ہے اور جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے آخرت اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اور تمہارے ساتھ ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی ۝ اور موت تم کو پالے گی تم جہاں کہیں بھی ہو گے[90]، اگرچہ مضبوط قلعوں کے اندر ہی ہو۔ اور اگر ان کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی گزند پہنچ جائے تو کہتے ہیں یہ تمہارے سبب سے ہے۔ کہہ دو ان میں سے ہر ایک اللہ کی طرف سے ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کا نام ہی نہیں لیتے ۝ تمہیں جو سکھ بھی پہنچتا ہے خدا کی طرف سے پہنچتا ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے[91] پہنچتا ہے۔ اور اے رسول، ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی گواہی کافی ہے ۝ اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے

کے درمیان ہوتا ہے۔ شیطان کے ہر کام کی بنیاد باطل پر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کے مستحکم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۸۹ منافقین اپنے ایمان و اخلاص کی دھونس جمانے کے لیے اب تک بہت بڑھ بڑھ کر جہاد کے لیے مطالبہ کر رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک ایک شخص جہاد کے جذبہ سے سرشار ہے لیکن پیغمبرؐ کی طرف سے ان کو صبر و انتظار، نماز و زکوٰۃ کے اہتمام کے ذریعے سے اپنے آپ کو مضبوط اور منظم کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ جب جنگ کا حکم دے دیا گیا تو ان کا یہ عجیب رویہ سامنے آیا کہ وہ خدا سے زیادہ انسانوں سے ڈرتے ہیں اور شاکی ہیں کہ اتنی جلدی جہاد کا حکم کیوں دے دیا گیا ہے۔

۹۰ یہ منافقین کے خوفِ موت کا علاج بتایا ہے کہ موت سے کسی کے لیے مفر نہیں، اس وجہ سے اس سے ڈرنا اور بھاگنا بے سود ہے۔ آدمی پر جو فرض جس وقت عائد ہوتا ہے اس کو عزم و ہمت سے ادا کرے اور موت کے مسئلے کو خدا پر چھوڑ دے۔

۹۱ یہ منافقین کے ایک ذہنی الجھاؤ سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ پیغمبر جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا کی رہنمائی میں کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر انہیں کوئی افتاد پیش آجائے تو اس کو پیغمبرؐ کی بے تدبیری کا نتیجہ قرار دیتے ہیں حالانکہ خیر ہو یا شر سب خدا کی مشیت سے ظہور میں آتا ہے اور شر انسان کے اپنے اختیار کے سوءِ استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا شر کا تعلق انسان کے اپنے نفس سے ہے۔

اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے اس پر تم کو نگران نہیں مقرر کیا ۝ ۸۰ اور یہ کہتے ہیں کہ سرِ تسلیم خم ہے، پھر جب تمہارے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ بالکل تمہارے قول کے برخلاف مشورت کرتا ہے اور اللہ لکھ رہا ہے جو سرگوشیاں وہ کر رہے ہیں، تو ان سے اعراض کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ بھروسے کے لیے کافی ہے ۝ ۸۱ اور کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بڑا اختلاف[92] پاتے ۝ ۸۲

اور جب ان کو کوئی بات امن یا خطرے کی پہنچتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر یہ اس کو رسول اور اپنے اولوالامر کے سامنے پیش کرتے تو جو لوگ ان میں سے بات کی تہہ کو پہنچنے والے ہیں وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے سے لوگوں کے سوا تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے ۝ ۸۳ پس اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔ تم پر اپنی جان کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں ہے اور مومنوں کو اس کے لیے ابھارو۔ توقع ہے کہ اللہ کافروں کے دباؤ کو روک دے اور اللہ بڑے زور والا اور عبرت انگیز سزا دینے والا ہے ۝ جو کسی اچھی بات کے حق میں کہے گا اس کے لیے اس میں سے حصہ ہے اور جو اس کی مخالفت میں کہے گا اس کے لیے اس میں سے حصہ ہے اور اللہ ہر چیز کی طاقت رکھنے والا ہے ۝ ۸۵ اور جب تمہیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو[94]۔ اللہ ہر

---

۹۲ یہ منافقین کے تضادِ فکر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ پیغمبرؐ کی مجلس میں تو قرآن اور پیغمبرؐ کی باتوں پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور اپنی مجلسوں میں اسی قرآن اور اسی پیغمبرؐ کی باتوں کو ہدفِ اعتراض بناتے اور ان احکام کے خلاف مشورت کرتے ہیں جن کو اپنی خواہشات اور اپنے مفادِ ذاتی کے خلاف پاتے ہیں گویا انہوں نے قرآن کو بیک وقت دو ارادوں کا ملغوبہ سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ قرآن کی وحدت اور اس کی ہم رنگی و ہم آہنگی اس بات کی نہایت قطعی شہادت ہے کہ اس میں مختلف ارادوں کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہی خدائے علیم و حکیم کا اتارا ہوا ہے۔ اس کتابِ عزیز میں اگر کسی اور فکر کی دراندازی ہوتی تو یہ متناقضات اور اختلافات کا ایک پراگندہ دفتر بن کے رہ جاتی۔

۹۳ اولوالامر کے مفہوم کے لیے دیکھیے اشارہ ۳۵۔ منافقین چونکہ ملت کے خیر خواہ نہیں تھے۔ اس وجہ سے افواہیں پھیلانے میں بڑے چابک دست تھے۔ یہاں یہ تعلیم دی کہ عوام کو اجتماعی نفع و ضرر کے معاملات میں مرجع و مستقل اپنے اولوالامر کو بنانا چاہیے جو دین اور دنیا دونوں کی ایسی سوجھ بوجھ رکھنے والے ہوں کہ پیش آنے والے معاملات و حالات میں شریعت و مصلحت کے تقاضوں کے مطابق قدم اٹھا سکیں۔

۹۴ اس ہدایت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ منافقین سے اعراض کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی بنا پر اندیشہ تھا کہ صحابہؓ

چیز کا حساب کرنے والا ہے ۝ اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تم سب کو قیامت کے دن کی طرف لے جا کے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کہنے والا کون ہو سکتا ہے ۝ ۸۷

پس تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم منافقین کے باب میں دو گروہ ہو رہے ہو[۹۵]۔ اللہ نے تو انہیں ان کے کیے کی پاداش میں پیچھے لوٹا دیا ہے، کیا تم ان کو ہدایت دینا چاہتے ہو جن کو خدا نے گمراہ کر دیا ہے؟ جن کو خدا گمراہ کر دے تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے ۝ یہ تو آرزو رکھتے ہیں کہ جس طرح انہوں نے کفر کیا ہے تم بھی کفر کرو کہ تم سب برابر ہو جاؤ۔ تو تم ان میں سے کسی کو اپنا ساتھی نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ اگر وہ اس سے اعراض کریں تو ان کو گرفتار کرو اور قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ اور ان میں سے کسی کو ساتھی اور مددگار نہ بناؤ[۹۶] ۝ صرف وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جن کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہو جن کے ساتھ تمہارا کوئی معاہدہ ہے یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ نہ اپنے اندر تم سے لڑنے کی ہمت پا رہے ہیں نہ اپنی قوم ہی سے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر دلیر کر دیتا تو وہ تم سے لڑتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، تم سے جنگ نہ کریں، تمہارے ساتھ صلح جویانہ رویہ رکھیں تو اللہ تم کو بھی ان کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا[۹۷] ۝ ۹۰

منافقین سے ربط ضبط اور سلام و کلام ختم کر دیتے اور اس طرح ایک معاشرتی بائیکاٹ کی شکل پیدا ہو جاتی جو اس مرحلے میں ابھی مطلوب نہ تھی۔ اسی طرح دار الحرب میں متعدد مسلمان موجود تھے جو حملوں میں مسلمانوں کی تلواروں کی زد میں آ سکتے تھے۔ اس لیے سلام کے شعار کو مومن و کافر کے درمیان ایک علامتِ فارقہ اور اسلامی معاشرہ میں وصل و فصل کی بنیاد قرار دیا۔

۹۵ یہ خطاب ان مسلمانوں سے ہے جو دار الحرب کے ان منافقین کے لیے اپنے دل میں بڑا نرم گوشہ رکھتے تھے جو بلا کسی عذرِ معقول کے، محض اپنے رشتوں اور قرابتوں یا جائداد و املاک کی محبت میں ہجرت سے گریزاں دار الکفر میں پڑے تھے۔ یہ مسلمان توقع رکھتے تھے کہ اگر ان منافقین کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو آہستہ آہستہ یہ پکے مسلمان بن جائیں گے۔ ان مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ یہ منافقین تو مسلمان بننے سے رہے البتہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ تم ان کے ساتھ بندھے رہے تو تمہیں بھی لے ڈوبیں گے۔

۹۶ دار الحرب کے منافقین کے مخلص سمجھے جانے کے لیے یہ کسوٹی قرار دی ہے کہ یہ اپنے ماحول سے ہجرت کر کے تمہارے ساتھ آ ملیں۔ اگر وہ ہجرت پر آمادہ نہیں ہوتے اور دار الکفر میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں تو تم ان کو دشمن اور دشمنوں کا ساتھی سمجھو اور ان کو جہاں پاؤ گرفتار اور قتل کرو۔ ان کے ساتھ کافروں سے مختلف رویہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔

۹۷ گرفتاری اور قتل کے حکم عام سے دو طرح کے مسلمانوں کو مستثنیٰ کیا، ایک وہ جن کا تعلق ایسے غیر مسلم قبائل سے ہو جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدۂ صلح ہو۔ ایسے لوگوں کی جان بخشی معاہدے کے احترام میں کی گئی۔ دوسرے وہ جو اپنی کمزوری اور پست

اور دوسرے کچھ ایسے لوگوں کو بھی تم پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی قوم سے بھی محفوظ رہیں[۹۸] لیکن جب جب فتنے کی طرف موڑے جاتے ہیں اس میں گر پڑتے ہیں۔ پس اگر یہ تم سے کنارہ کش نہ رہیں، تم سے صلح جویانہ رویہ نہ رکھیں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تم ان کو گرفتار کرو اور قتل کرو جہاں کہیں پاؤ۔ یہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو کھلا اختیار دیا ہے ۝ ۹۱

اور کسی مومن کے لیے روا نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے[۹۹]۔ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے ذمہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور خون بہا[۱۰۰] ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے الا یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پس اگر مقتول تمہاری دشمن قوم کا فرد ہے لیکن وہ بذاتِ خود مسلمان ہو تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد ہے جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو خون بہا بھی ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی[۱۰۱]۔ جس کو یہ استطاعت نہ ہو تو وہ لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اللہ کی طرف سے ٹھہرائی ہوئی توبہ ہے۔ اللہ علیم و حکیم ہے ۝ اور جو کوئی کسی مسلمان کو عمداً

کمی کی بنا پر اپنی غیر جانب داری کی درخواست کریں، نہ اپنی قوم کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنے کے لیے تیار ہوں نہ مسلمانوں کے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑنے کی جرأت کر رہے ہوں۔

۹۸ یہاں جماعتوں کی طرف اشارہ ہے جن کی جانبداری واقعی اور حقیقی نہ تھی۔ یہ دعویٰ تو غیر جانبداری کا کرتیں لیکن جب ان پر کفار کا دباؤ پڑ جاتا تو قوم کی شرارتوں میں شریک ہو جاتیں۔ ان کے ساتھ کھلے دشمنوں جیسا معاملہ کرنے کا حکم دیا۔

۹۹ بہت سے مخلص مسلمان کفار کے علاقے میں گھرے ہوئے تھے۔ جنگ کی صورت میں اندیشہ تھا کہ ان کو مسلمانوں ہی کے ہاتھوں گزند پہنچ جائے گا۔ اس لیے مسلمانوں پر قتل مومن کی سنگینی ان آیات میں واضح فرمائی۔

۱۰۰ اس زمانہ میں غلامی ختم ہو چکی ہے اب اس کا بدل صدقہ ہے جو غلام کی قیمت کے تناسب سے ہو۔ اگر یہ صدقہ غریب و نادار مسلمانوں کے قرضوں کی ادائیگی اور ان کے رہن شدہ املاک کے چھڑانے پر صرف کیا جائے تو ان شاء اللہ یہ طریقہ شریعت کے منشا کے خلاف نہ ہوگا۔ خون بہا کے معاملہ میں اسلام نے عرب کے معروف کو قانون کی حیثیت دے دی تھی۔ جن معاملات کا تعلق معروف سے ہو وہ زمانہ اور حالات کے تغیر سے اپنے اصل مقصد کو باقی رکھتے ہوئے متغیر ہو جاتے ہیں۔ اس تغیر کی نوعیت کو طے کرنا اربابِ اجتہاد کا کام ہے۔

۱۰۱ یعنی مقتول مسلمان اگر دشمن قوم کا فرد ہو تب تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کر دینا ہی کافی ہے لیکن اگر اس کا تعلق معاہد قوم سے ہو تو اس صورت میں غلام آزاد کرنے کے علاوہ خون بہا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

تزکیۂ نفس
امین احسن اصلاحی

آدمی کا تعلّق ریاست سے

انسان کو جو برکتیں معاشرہ سے حاصل ہوتی ہیں ان میں سے ایک بہت بڑی برکت یہ ہے کہ معاشرہ اپنی اجتماعی تنظیم کی قوت اور اس کے زور و اثر سے اس کو باہمی تعدیوں سے بھی محفوظ رکھتا ہے اور باہر سے کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو اس سے بھی اس کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ چیز انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ تحفظ اس کو حاصل نہ ہو تو وہ ہر وقت اندرونی اور بیرونی خطروں میں گھرا رہے گا جس سے اس کی معاش و معیشت اور تعمیر و تمدن کی رہنما اعلیٰ صلاحیتیں دب دبا کر ختم ہو جائیں گی جو اس کے اندر ودلیعت ہیں۔

انسان نے اپنی اسی فطری ضرورت کے تقاضوں سے، شروع ہی سے، جب سے اس کی تاریخ کا کچھ سراغ ملتا ہے، جس طرح ایک اجتماعیت پسند حیوان (SOCIAL ANIMAL) کی زندگی پسند کی ہے اسی طرح ایک سیاسی مخلوق (POLITICAL BEING) کی زندگی کا بھی پورا التزام رکھا ہے۔ اس کی تاریخ کا کوئی دور بھی ایسا نظر نہیں آتا ہے جب وہ حکومت سے بالکل بے نیاز رہا ہو۔ عام اس سے کہ یہ حکومت پدرسرانہ قسم کی رہی ہے یا قبائلی نوعیت کی، آمرانہ طرز کی رہی ہے یا رضاکارانہ مزاج کی؛ بہرحال کسی نہ کسی قسم کا سیاسی نظام اس نے ضرور اختیار کیا ہے، اس کو اپنے قیام و بقا اور تعمیر و ترقی کے لیے ضروری و لازمی جانا ہے اور اس کے فوائد سے بہرہ مند ہوتے رہنے کے لیے جن قربانیوں کا حالات نے مطالبہ کیا ہے وہ بھی اس نے بڑی فیاضی سے پیش کی ہیں۔

اس وقت ہم حکومت کے فلسفہ اور اس کے نظام پر کوئی گفتگو کرنی نہیں چاہتے، خاص اس موضوع پر ہم نے 'اسلامی ریاست' کے عنوان سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ یہاں ہمارے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ ایک مسلم کی حیثیت سے ہمارا تعلق اس ریاست سے کس نوعیت کا ہونا چاہیے جس کے ہم شہری ہیں؟

حکومت کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام :

اس سوال کے صحیح جواب کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیجیے کہ اس دور میں کس نوعیت کی حکومتوں سے آپ کو سابقہ پیش آسکتا ہے اس کے بعد یہ معین کرنے میں آسانی ہوگی کہ ایک مسلم کی حیثیت سے، ان میں سے کس کے ساتھ، آپ کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

ایک شکل تو یہ ہو سکتی ہے کہ حکومت غیر مسلموں کی ہو؛ آئین اور قانون غیر اسلامی ہو، لیکن پرسنل لا کے حد تک، ایک اقلیت کی حیثیت سے آپ کے حقوق محفوظ ہوں، دین کی تبلیغ و دعوت کی اجازت ہو اور اگر کوئی شخص آپ کی دعوت سے متاثر ہو کر اس کو قبول کر لے تو اس کو ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنایا جاتا ہو۔

دوسری شکل یہ ہے کہ حکومت غیر مسلموں کی یا نام نہاد مسلمانوں کی ہو، لیکن اس میں ایک خاص غیر اسلامی نظریۂ حیات کے سوا کسی اور نظریہ یا عقیدہ کی دعوت و اشاعت ممنوع ہو اور اگر کوئی اس کی جرأت کرے تو اس کو مستحق سزا سمجھا جاتا ہو۔

تیسری شکل یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی ہو، لیکن آئین و قانون جاہلیت اور اسلام، دونوں کا ملغوبہ ہو؛ زبانوں پر نعرہ اسلام کا ہو، لیکن عمل میں ایک قدم اسلام کی طرف اٹھتا ہو تو دوسرا قدم جاہلیت کی طرف بھی بڑھتا ہو۔

چوتھی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ حکومت ظاہر اور باطن، دونوں میں اسلامی ہو، آئین و قانون کتاب و سنت پر مبنی ہو، حکومت کے چلانے والے قولاً و عملاً مسلمان ہوں اگرچہ اشخاص اور نظام، دونوں میں بعض اعتبارات سے خامیاں بھی ہوں۔

ان چاروں قسموں کی حکومتوں کے معاملے میں آپ کا رویہ اگر کلیتہً نہیں تو فی الجملہ الگ الگ ہوگا۔ اب ہم اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلی قسم کی حکومت :

پہلی قسم کی حکومت ایک غیر مسلم حکومت ہونے کے پہلو سے اگرچہ ایک مسلمان عقیدہ اور مسلک سے متصادم ہے اس وجہ سے جو مسلمان اس کے اقتدار کے زیر اثر زندگی بسر کریں گے ان کے لیے اپنے عقیدہ و مسلک اور اپنی تہذیب اور روایات کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھنا کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ صرف مذہب اور روایات ہی کے پہلو سے نہیں، بلکہ معاشی اور سیاسی پہلو سے بھی یہ صورت کسی طرح ان کے لیے سازگار نہیں

ہے۔ یہ چیز جب بھی گوارا کی جائے گی بدرجۂ مجبوری ہی گوارا کی جائے گی۔ بس اتنی بات غنیمت ہے کہ سیکولر ہونے کے سبب سے توقع ہے کہ کم از کم ذاتی عقیدہ و مذہب کے معاملہ میں وہ کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ اگر یہ چیز حاصل ہو تو ایک مسلمان ایسی غیر مسلم حکومت کا وفادار شہری رہ سکتا ہے۔ اس کی اس وفاداری کی مثال ویسی ہی ہوگی جس کا ذکر ہم پیچھے ماں باپ کے حقوق والے باب میں کر چکے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص خود مسلمان ہو، لیکن اس کے ماں باپ غیر مسلم ہوں تو وہ دنیوی معاملات کے حد تک ان کا وفادار رہے گا۔ البتہ اپنے دین کے معاملہ میں ان کی مداخلت گوارا نہیں کرے گا۔

اس زمانے کی ترقی یافتہ جمہوری حکومتوں میں بالعموم آدمی کو اپنے دین و عقیدہ کی تبلیغ و دعوت کی بھی آزادی ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص اس کی دعوت قبول کر کے دین و عقیدہ میں اس کا شریک بن جاتا ہے تو اس کی راہ میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جاتی ــــ اگر یہ آزادی کسی ریاست میں حاصل ہے تو ایک مسلمان اس کے اندر اپنا دینی فریضۂ شہادتِ حق ادا کر سکتا ہے اور اس طرح کے ماحول میں اس کے اوپر دین کی اس سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

یہ بات یہاں یاد رکھیے کہ ایک مسلمان سے اسلام کا اصل مطالبہ صرف یہی ہے کہ وہ جہاں رہے حق کی شہادت دیتا رہے۔ اگر یہ کام وہ کر رہا ہے تو وہ اپنا اصل ملی فریضہ جو اس پر وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرۃ - ۲ : ۱۴۳) (اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے) کی رو سے عائد ہوتا ہے، ادا کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ اسلام نے اس کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔

اس زمانے میں دین سے بعض بے خبر مدعیوں نے اسلامی حکومت کے قیام کے جوش میں، منتشر افراد اور ایک منظم معاشرہ کی ذمہ داریوں میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھا، متفرق افراد سے انہوں نے اسلامی حکومت قائم کرنے کا عہد لینا شروع کر دیا حالانکہ متفرق افراد اپنے دائرہ میں صرف دعوتِ دین اور شہادتِ حق کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اگر یہ کام وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق کر رہے ہیں تو وہ عند اللہ اس امر کے لیے مسؤل نہیں ہوں گے کہ انہوں نے حکومتِ اسلامیہ کا نعرہ لگانے والوں کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ اسلامی حکومت قائم کرنے کی ذمہ داری اُس منظم منظم معاشرہ پر عائد ہوتی ہے جو کسی خطہ میں یہ پوزیشن حاصل کر چکا ہو کہ اس میں اپنی صواب دید کے مطابق قانون نافذ کر سکے۔ سورۂ حج میں ایک منظم اسلامی معاشرہ کی اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ٥

یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

(الحج - ۲۲ : ۴۱)

مسلمانوں کے سامنے یہ پروگرام اس وقت رکھا گیا ہے جب فتح مکہ کی منزل سامنے نظر آنے لگی ہے۔ اس سے پہلے کی زندگی میں ان کو جن مراحل سے گزرنا پڑا ان کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ لیکن ہمارے اس دور کے غازیوں کو اس سوال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو جن لوگوں کو بے وقوف بنانا ہے ان کے لیے اس خشک اور صبر آزما پروگرام میں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔ وہ پٹ منگنی اور پٹ بیاہ چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ پہلا ہی قدم یا تو بیعتِ رضوان سے اٹھاتے ہیں یا فتح مکہ سے۔

جن لوگوں کو اجتماعیات کا کچھ تجربہ ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ جو جماعت قوم کی اجتماعی اصلاح کے منصوبے کے ساتھ اٹھے اس کی کامیابی کے لیے سب سے مقدم شے یہ ہے کہ اس کا عملی پروگرام اس کی جماعتی قوت و صلاحیت کے بالکل ہم وزن ہو۔ جس کی قوت صرف سیر بھر بوجھ اٹھا سکتی ہو اس کے اوپر من بھر بوجھ لاد دینا پرلے سرے کی حماقت ہے۔ جو لوگ دین اور دیانت، دونوں سے عاری ہوتے ہیں ممکن ہے اس طرح وہ اپنے بعض ذاتی مقاصد پورے کر لیتے ہوں، لیکن اس قسم کے اصحاب الاغراض کے ہاتھوں اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔

دوسری قسم کی حکومت:

دوسری قسم کی حکومت، خواہ غیر مسلموں کی ہو یا نام نہاد مسلمانوں کی، ایک مسلمان کے دین و ایمان کے لیے اس عہد کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس نظام کے بانیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ان کے نظام کے قیام و استحکام کے لیے ہر قسم کے دین کی بیخ کنی لازمی ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ تجزیہ بالکل مبنی بر حقیقت ہے۔ اشتراکیت کے ساتھ دہریت کے سوا اور کسی دین کا جوڑ نہیں ہے۔ اب اگرچہ یہ نمائش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ دنیا کی دوسری حکومتوں کی طرح ان کی حکومت میں بھی ہر شخص کو اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت

ہے۔ لیکن وہ جو ذہنی تطہیر (BRAIN WASHING) کرتے ہیں اس کے بعد آدمی کے اندر اتنی صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی کہ رسوم کی ادائیگی اس کے لیے کچھ نافع ہو سکے۔

سب سے زیادہ غم اور افسوس یہ ہے کہ جن نام نہاد مسلمانوں نے اس نئے دین کو اختیار کر لیا ہے ان کے رویے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دین کے اس کے اصل بانیوں سے بھی زیادہ وفادار ہیں۔ انہوں نے اس کی خاطر خود اپنے بھائیوں پر جو ظلم ڈھائے ہیں شاید دوسرے اس سے زیادہ ظلم نہ ڈھا سکتے۔ اب ان کے ظلم سے بچنے کی بظاہر واحد راہ یہی باقی رہ گئی ہے کہ آدمی اپنا گھر در چھوڑ کر کسی دوسرے علاقہ کو ہجرت کر جائے، لیکن اس کڑے امتحان سے گزرنے کا کوئی حوصلہ بھی کرلے تو اس زمانے میں اس سے بھی زیادہ مشکل سوال یہ ہے کہ ؎

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلیؔ اب کہاں جائیں

تاہم جو ممالک اب اشتراکیت کے نرغے میں آچکے ہیں ان کے اندر کے مسلمانوں کے لیے دو ہی راہیں باقی ہیں: یا تو ارتداد کی راہ اختیار کریں یا جہاد اور ہجرت کی۔ پہلی راہ اختیار کرنے کا مشورہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو نہیں دے سکتا۔ زندگی کتنی ہی عزیز سہی، لیکن ایمان سے زیادہ عزیز نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی مسلمان کے سامنے یہ سوال آجائے کہ وہ ایمان اور زندگی میں سے کس کو اختیار کرے اور کس کو چھوڑے تو اس کی سعادتِ دارین اس میں ہے کہ وہ زندگی کو قربان کر کے اپنے ایمان کو بچائے۔ رہا ہجرت اور جہاد کا معاملہ تو اس کا تعلق حالات اور مواقع سے ہے۔ اور اس پر غور کرنا، رہنمائی دینا اور اس کے اسباب و وسائل فراہم کرنا اُن مسلمان حکومتوں کا کام ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اشتراکیت کی یلغار سے محفوظ ہیں۔ ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ باہمی تعاون سے اس مسئلہ کا حل سوچیں اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے جرأت کے ساتھ اقدام کریں۔ اب اس میں تغافل کی پالیسی مہلک اور تاخیر خودکشی ہوگی۔ اشتراکیت کے زیرِ اقتدار پھنسے ہوئے مسلمانوں کا معاملہ اگر انہی پر چھوڑ دیا گیا، اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کی طرف سے ان کو کوئی سہارا ملنے کی توقع نہ ہوئی تو پھر وہ اس ماحول میں یا تو تحلیل ہو جائیں گے یا گمشت کرنا ہو جائیں گے اور اس پالیسی کا انجام بالآخر یہ ہوگا کہ بہت جلد وہ علاقے بھی اس سیلاب کی زد میں آجائیں گے جو بظاہر محفوظ ہیں۔

تیسری قسم کی حکومت :

تیسری قسم کی حکومت کی سب سے نمایاں مثال خود ہمارے ملک کی حکومت ہے۔ اس اعتبار سے تو یہ بسا غنیمت ہے کہ اس کا آغاز اسلام کے نعرہ سے ہوا ہے اور یہ نعرہ ابتداء سے لے کر اب تک برابر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ جتنی پارٹیاں اور جتنے لیڈر اس کی سیاست کے میدان میں اترے ہیں سب نے کسی نہ کسی

نوعیت سے اس نعرے کا سہارا ضرور لیا ہے۔ اس کے بغیر کسی نے میدان میں اترنے کا حوصلہ نہیں کیا ہے۔

اس ملک کی تاریخ کا یہ پہلو ان لوگوں کے لیے بہت ہی حوصلہ افزا ہے جو اس کو ایک حقیقی اسلامی ریاست کی شکل میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اس تمنا کے بروئے کار آنے کے لیے ضروری ہے کہ اس راہ میں جو مشکلات حائل ہیں ان کا صحیح صحیح اندازہ کر لیا جائے تاکہ اس کے لیے اس نہج پر کوشش کی جائے جو نتیجہ خیز ہو۔

ہم یہاں چند حقائق کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو اگرچہ بعض لوگوں کو تلخ محسوس ہوں گے، لیکن ان کو جس طرح سمجھ نہ لیا گیا تو اندیشہ ہے کہ جس طرح یہ نعرہ اب تک صرف ایک نعرہ ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، وہ اس طرح ممکن ہے کہ کچھ دنوں اور بھی باقی رہے، لیکن بالآخر یہ بالکل بے اثر ہو کر رہ جائے گا۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہماری قوم کی زبان پر اسلام، اسلام کی رٹ تو بہت ہے، لیکن اسلام کا شعور بالکل نہیں ہے۔ اس معاملہ میں عوام اور خواص سب یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کے لیڈر، جو بڑی بلند آہنگی سے اسلام کا نعرہ بھی بلند کرتے رہے ہیں، صاف صاف کہتے ہیں کہ ہم اور ہمارے باپ دادا صدیوں سے اسلام پر چلے آرہے ہیں، اب اس طریقہ کے سوا اسلام اور کیا ہے جو اس ملک میں لایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ یہ مسلمان ہیں اس وجہ سے یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ سے آپ اسلامی بن جاتا ہے، اس کے اسلامی ہونے کے لیے کسی اور سند کی ضرورت نہیں ہے۔ ؎

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

ان لوگوں کو یہ گھمنڈ بھی ہے کہ انہی کے آباؤ اجداد کے واسطہ سے اس ملک کے لوگوں کو دین ملا ہے تو ان کے سوا کوئی دوسرا اس بات کا اہل کس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کو دین سکھانے کے لیے اٹھے۔

اربابِ اقتدار کی طرف سے اسلامائزیشن کے پروگرام نے اس زمانے میں ایک اور غلط فہمی، شدید قسم کی، خاص طور پر ان کے سیاسی حریفوں کے اندر یہ بھی پیدا کر دی ہے کہ 'اسلام، اسلام' کا نعرہ محض اپنے اقتدار کے تحفظ اور عوام فریبی کے لیے لگایا جا رہا ہے، اس کے اندر اخلاص اور صداقت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ اس خیال نے اس زمانے میں بہت سے لوگوں کے اندر دین بیزاری کی ایک کیفیت پیدا کر دی ہے جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی گئی تھی۔

جہاں تک ملک کے عوام کا تعلق ہے ان کے دینی جوش کے بعض وقتی مظاہروں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ فی الواقع یہ کسی حقیقی دینی محرک ہی کے تحت ظہور میں آئے، بلکہ ان کا صحیح طور پر تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی دین سے زیادہ دوسرے عوامل کا دخل رہا ہے، لیکن ان کو پس پردہ ہی رکھنے میں

مصلحت سمجھی گئی۔ اوّل تو عوام کی اکثریت اپنے پیٹ اور تن کے مسائل میں اس طرح الجھی ہوئی ہے کہ اس کو کسی سیاسی یا مذہبی مسئلہ پر غور کرنے میں یا اس میں حصہ لینے کی سرے سے فرصت ہی نہیں ہے اور اگر کچھ لوگوں کے اندر کچھ مذہبی رمق ہے تو وہ یا تو اپنے فرقہ کے مولویوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں یا اپنے حلقے کے کسی پیر سے وابستہ ہیں۔ وہ اپنے دینی معاملات میں انہی کی آنکھوں سے دیکھتے اور انہی کے کانوں سے سنتے ہیں، مجال نہیں ہے کہ اس سے ہٹ کر کچھ سوچ یا سمجھ سکیں۔

جنہوں نے کچھ تعلیم پائی ہے۔ عام اس سے کہ یہ تعلیم مذہبی ہے یا جدید دنیوی، ان کا حال بھی یہ ہے کہ ان سے کسی خیر کی امید بظاہر ایک امید موہوم ہی ہے۔ مذہبی تعلیم پانے والوں کے متعلق اگر ہم یہ کہیں تو غالباً بے جا نہ ہو کہ انہوں نے اسلام کی نہیں، بلکہ اپنے فرقہ کے دین کی تعلیم پائی ہے اور اسی کو وہ کفر اور اسلام کی کسوٹی بنائے ہوئے ہیں۔ اس سے الگ ہو کر ان کے لیے کچھ سوچنا ناممکن اور اس کو اختیار کرنا محال ہے۔ ان سے یہ اپیل کرنا کہ وہ اختلافی امور کو چھوڑ کر صرف مشترک امور پر تقریریں کریں اور خطبے دیں اپیل کرنے والوں کی بے خبری پر دلیل ہے۔ ان کے درمیان اشتراک اگر ہے تو چند اسماء میں ہے ان کے مسمّی ان میں سے ہر ایک کے نزدیک بالکل الگ الگ ہیں۔ توحید، آخرت اور رسالت جیسے بنیادی مسائل میں بھی ایسے ایسے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں کہ ممکن نہیں رہا کہ مختلف فرقوں کے لوگ کسی ایک مسجد میں، ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ سکیں۔

ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ اس نے تعلیم کا مقصد سرکاری نوکری کرنا سمجھ رکھا ہے اور وہ یہ کام نہایت وفاداری کے ساتھ کر رہی ہے یہ نظام تعلیم انگریزوں نے اس مقصد سے قائم کیا تھا اور اب تک یہ بلا کسی بنیادی ترمیم و اصلاح کے، اسی مقصد سے قائم کیا ہے اس وجہ سے ان لوگوں کو ملامت نہیں کی جا سکتی جو اس مقصد کو وفاداری کے ساتھ پورا کر رہے ہیں۔ جب ان کو ایک آزاد قوم کی ذمہ داریوں، ایک امت مسلمہ کے فرائض اور شہداء اللہ علی الناس اور خلفاء اللہ فی الارض کا کوئی تصور سرے سے دیا ہی نہیں گیا تو آخر ان کے تقاضوں اور مطالبوں کا شعور ان کے اندر کہاں سے ابھرتا؟

اس گروہ کے اندر جو لوگ ذہنی اعتبار سے ذرا اونچے ہوئے اور انہوں نے قوم کی صلاح و فلاح کے کاموں میں کچھ حصہ لیا چونکہ اسلام کے فکر و فلسفہ سے وہ بالکل محروم اور انگریزوں کی تہذیب و تعلیم سے نہایت مرعوب تھے اس وجہ سے انہوں نے یا تو کھلم کھلا ہر شعبۂ زندگی میں انہی کے طور طریقے کی پیروی کی دعوت دی اور اگر یہ جرأت نہ کر سکے، بلکہ کچھ اسلام کی بھی لاج رکھنی چاہی تو ان کی پھیلائی ہوئی ساری ضلالتوں کو اسلام کے نام سے قوم پر لادھا دینے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اگر یہ کہا جائے کہ انگریزوں کے دور حکومت میں ہماری قوم ان کے سانچے میں اتنی نہیں ڈھلی تھی جتنی اب ڈھل گئی ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ اب جو صورت حال ہے اس کو پیش نظر رکھ کر بے تکلف یہ پیشین گوئی کی جا

سکتی ہے کہ بہت جلد وہ وقت آ رہا ہے جب افکار اور پیمانے اس طرح تبدیل ہو جائیں گے کہ ہمارے ملک کی اسمبلیوں کے انتخابات میں ہمارے بڑے بڑے علماء اور مشائخ اداکاروں اور اداکارنیوں سے شکست کھا جائیں گے اور اس قوم میں ایک شخص بھی ان پر ترس کھانے والا نہ ہوگا۔

یہ ہم نے نہایت مختصر لفظوں میں اس معاشرے کی جو تصویر کھینچی ہے اگر آپ بغیر کسی تعصب کے اس پر غور کریں گے تو ان شاء اللہ اس کو بالکل صحیح پائیں گے۔ اب آپ اس ملک کے ایک مسلمان اور فرض شناس شہری کی حیثیت سے غور کیجیے کہ آپ پر اس کو خطرات سے بچانے اور صحیح سمت میں اس کو آگے بڑھانے میں کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؛ اس سوال پر غور کرنے کی دعوت ہم اس وجہ سے دے رہے ہیں کہ بحیثیت ایک مسلمان کے آپ پر فرض ہے کہ آپ اس سوال کا جواب معلوم کریں اور اس پر عمل کریں ورنہ آپ اپنے فرض سے تغافل برتنے والے ٹھہریں گے۔

اس سوال پر غور کرنے کی ذمہ داری ہر شخص پر ہے، خواہ وہ ملک کا ایک عام شہری ہے یا ایک با اقتدار و با اختیار حکمران۔ بلکہ ایک با اقتدار کے لیے دوسروں کی نسبت زیادہ ضروری ہے کہ وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہزار بار سوچے کہ اس کے اقدام کے نتائج کیا کچھ ہو سکتے ہیں۔ ایک عام آدمی کی استطاعت محدود ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے کسی قول یا فعل کے نتائج بھی محدود ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ایک با اقتدار اگر کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس کے نتائج بہت دوررس ہو سکتے ہیں اور یہ نیک ہوں گے اگر اس کا اقدام صحیح سمت میں ہے اور بد بھی ہو سکتے ہیں اگر خدانخواستہ اقدام غلط سمت میں ہے۔

ہمارے معاشرے کے متعلق اگر کوئی شخص یہ رائے قائم کرے کہ یہ اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے بالکل ہموار ہے تو میرے نزدیک اس سے زیادہ غلط رائے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اسلام کا نام تو بے شک اس قوم کو بہت محبوب ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کا اسلام ایک دوسرے کے اسلام سے اتنا مختلف ہو گیا ہے کہ ان کو ایک پر متفق کرنے میں ایک عظیم جدوجہد، بلکہ ایک عظیم جہاد کے مرحلہ سے گزرنا پڑے گا۔ اس جہاد سے گزرے بغیر اگر زندگی کے بعض گوشوں میں کچھ قوانین شریعت —— از قسم حدود و تعزیرات —— نافذ کر دیے گئے تو ان کی مثال ان بدقسمت بیجوں کی ہوگی جو کسی شور اور ناہموار زمین میں پھینک دیے گئے ہوں۔ وہ ضائع تو بہرحال ہوں گے، لیکن ان کے ضائع ہونے سے بھی بڑا حادثہ یہ ہوگا کہ اس سے اسلامی شریعت کے متعلق شدید قسم کی غلط فہمی پیدا ہوگی بلکہ آئندہ کے لیے شاید اس کے لیے نفاذ کا راستہ بھی مسدود ہو جائے۔

اس وقت کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ معاشرہ کی فکری و نظری ناہمواریوں کو دور کرنے کے لیے اس نصب العین کو سامنے رکھ کر ایک مہم چلائی جائے کہ اس کے اندر ایک امت مسلمہ بننے کا شعور بیدار ہو۔ یہ شعور بیدار کرنے کے

لیے بڑی انقلابی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اس کے لیے ملک کے ہر شہری کو یہ بتانا اور سکھانا پڑے گا کہ ہم مسلمان اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے سوا اور کسی چیز کے پابند نہیں ہیں، ہمارے نزدیک حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی یہی ہیں، ان پر پرکھے بغیر کسی چیز کو اختیار کرنا ہمارے لیے جائز نہیں۔ قرآن کے متعلق لوگوں کی یہ عام غلط فہمی دور کرنی پڑے گی کہ یہ محض بطور تبرک تلاوت یا ایصالِ ثواب کی چیز ہے اور اس کے معانی و مطالب سے متعلق جو کچھ تفسیر کی مشہور کتابوں میں ہے بس وہی کافی ہے، اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی جگہ ذہنوں میں یہ عقیدہ راسخ کرنا پڑے گا کہ قرآن قیامت تک کے لیے، ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی کرنے والا صحیفہ ہے اور اس کے اندر حکمت و فلسفہ کے جو خزانے بند ہیں وہ کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ اس طرح لوگوں کو فرقہ وارانہ اور گروہی تعصبات سے آزاد کرنے کے لیے ان کو یہ سکھانا پڑے گا کہ ہماری فقہ کے تمام ائمہ ہم سب کے مشترک امام ہیں اور ان کے فقہی اجتہادات سب، بلا امتیاز و تفریق، ہمارا مشترک سرمایہ ہیں۔ ہمارے اصحابِ علم کا فرض ہے کہ وہ اس پورے ذخیرہ کا بغیر کسی تعصب و تنگ نظری کے جائزہ اور ان کے جن اجتہادات کو کتاب و سنت اور عقل و مصلحت سے اوفق پائیں ان کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے اختیار کریں اور دوسروں کو اختیار کرنے کا مشورہ دیں۔

ظاہر ہے کہ اس نصب العین کے حصول کے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنے تعلیمی اور تبلیغی نظام کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ موجودہ مدارس کو، خواہ وہ جدید ہیں یا قدیم، بالکل نئی بنیادوں پر استوار کیے بغیر اس راہ میں کوئی نتیجہ خیز کوشش ممکن نہیں ہوگی۔ ان اداروں کو نیا نصب العین بھی دینا ہوگا، ان کے لیے مقصد کے مطابق نیا موادِ تعلیم اور جدید نظامِ تربیت بھی فراہم کرنا ہوگا اور معلموں و مربیوں کو نئے تصورِ تعلیم و تربیت سے آشنا اور مانوس بھی کرنا ہوگا اور ان سب کاموں سے کٹھن کام یہ ہوگا کہ اس کی مزاحمت کے لیے جو عناصر سر اٹھائیں گے، خواہ اندر کے ہوں یا باہر کے، ان سے بہرحال نمٹنا ہوگا، تدبر اور تدبیر سے بھی اور حالات مجبور کر دیں تو طاقت سے بھی۔

یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم و تربیت کے نظام میں جو دو عملی، بلکہ صحیح لفظوں میں جو بدعملی پائی جاتی ہے وہ یک قلم ختم کر دی جائے۔ صرف ایک نظامِ تعلیم ہو جو شہداء اللہ فی الارض کی ایک امت تیار کرنے کے نصب العین کو سامنے رکھ کر ہر شعبۂ تعلیم کی نگرانی کرے۔ جدید دور کے تمام اعلیٰ علوم کے ساتھ اعلیٰ عربی زبان اور قرآن و حدیث اور اسلامی فقہ اور قرآنی حکمت و فلسفہ کی تعلیم کا ایسا بندوبست کیا جائے کہ ہمارے نوجوان نہ دنیا کے علوم میں کسی احساسِ کمتری کے شکار ہوں نہ اپنے دین کے معاملہ میں۔

ٹی وی کو اگر تعلیم و تبلیغ کے لیے خاص کیا جا سکے تو اس کی بڑی افادیت ہے۔ لیکن اگر یہ ناممکن ہے، اس کی اصلاح نہ ہو سکے تو پھر بہتر ہے کہ اسلام کا نام نہ لیا جائے۔ اس کے موجودہ شکل میں ہوتے ہوئے ناممکن ہے کہ کوئی

اسلامی جدوجہد کامیاب ہو سکے۔

ہمارے اخبارات بالخصوص اردو اخبارات کا حال بھی نہایت مایوس کن ہے لیکن ان کی اصلاح ناممکن نہیں ہے۔ اگر حکومت چاہے تو ایک دن میں ان کو شریفانہ روش اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ وہ کسی جبر کے بغیر ہی درست ہو جائیں بشرطیکہ جو لوگ معاملات کے سربراہ کار ہیں وہ اپنے مذاق درست کر لیں۔ مساجد کے ائمہ کے ذریعے جو فتنے لوگوں کے اندر پھیلتے ہیں ان کا سدباب فی الحال مشکل ہے۔ اس میں بے حسی کو بھی دخل ہے اور ان گروہی تعصبات کو بھی جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ تعلیمی نظام کی اصلاح سے یہ خرابی دور ہو سکے گی۔

یہ ہم نے چند اصولی باتوں کی طرف اجمال کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ جو لوگ اس قوم اور حکومت کی خدمت سے متعلق اپنا فرض ادا کرنا چاہتے ہوں، خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہوں، وہ ان مقاصد کو لوگوں کے ذہنوں سے قریب لانے کے لیے جو کوشش بھی کریں گے وہ ان شاء اللہ اس کا اجر پائیں گے۔

چوتھی قسم کی حکومت :

چوتھی قسم کی حکومت اصل آئیڈیل اسلامی حکومت ہے۔ یہی ہر مسلمان کا مطلوب و مقصود ہونی چاہیے یہ اگر حاصل ہو تو اس کی خدمت و حفاظت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا مسلمان کے لیے سعادتِ دارین ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ نہ یہ کہیں بنی بنائی موجود ہے اور نہ آسانی سے بن سکتی ہے۔ تاہم یہ کوئی خیالی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ عملاً اس دنیا میں وجود پذیر ہو چکی ہے۔ صحیح نہج سے جدوجہد کی جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں ہے کہ وہ پھر اس کا جلوہ دکھا دے۔ اور فرض کیجیے یہ سعادت نہ بھی حاصل ہو سکے تو اس کے حصول کے لیے جدوجہد کی راہ اب بھی کھلی ہوئی ہے۔ ہم اس مبارک مقصد کے لیے جدوجہد کر کے اپنی پاکیزہ نیت کا ثواب تو حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ اس مقصد کے لیے جدوجہد کا طریقہ بعینہٖ وہی ہے جو اس ریاست سے متعلق ہم نے بیان کیا ہے۔

افادات فراہی

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

مولانا فراہیؒ کے قلمی حواشی الاتقان فی علوم القرآن پر (۲)

مولانا فراہیؒ نے مندرجہ ذیل الفاظ کی شرح پر خط کھینچا ہے جس سے ان کے مذکورہ بالا تبصرہ کی تائید ہوتی ہے۔ ہم یہ الفاظ اور ان کی شرح لکھتے ہیں:

۱- أَمَّرْنا مترفیها	(الاسراء : ۱۶)	سلطنا شرارها [۱]
۲- لا تَقْفُ	(الاسراء : ۳۶)	لا تتبع [۲]
۳- الصدفین	(الکهف : ۹۶)	الجبلین [۳]
۴- سَوِيًّا	(مریم : ۱۰)	من غیر خرس [۴]
۵- سَرِيًّا	(مریم : ۲۴)	هو عیسی [۵]
۶- كُلَّ شَيْءٍ خلقه	(طٰہٰ : ۵۰)	خلق لکل شیء زوجه [۶]
۷- ثم هدی	(طٰہٰ : ۵۰)	لمنکحه ومطعمه ومشربه ومسکنه [۷]
۸- لا یضل	(طٰہٰ : ۵۲)	لا یخطئ [۸]
۹- تارة	(طٰہٰ : ۵۵)	حاجة [۹]
۱۰- فلا یخاف ظلما	(طٰہٰ : ۱۱۲)	ان یظلم فیزاد فی سیأته [۱۰]
۱۱- جذاذا	(الانبیاء : ۵۸)	حطاما [۱۱]

حاشیہ ۱ تا ۲۱:
فاضل مضمون نگار نے یہاں ان الفاظ کا قرآن مجید میں موقع و محل بیان کیا ہے۔ اس کے نقل کرنے میں طوالت ہے اس لیے حواشی کو حذف کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

۱۲- سامرا تهجرون	(المؤمنون : ۶۷)	تسمرون حول البیت وتقولون هجرا [۱۲]
۱۳- هَبَاءً مَّنثُورًا	(الفرقان : ۲۳)	الماء المهراق [۱۳]
۱۴- طَائِرُكُمْ	(النمل : ۴۷)	مصائبکم [۱۴]
۱۵- ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ	(النمل : ۶۶)	غاب عنهم [۱۵]
۱۶- وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ	(الجاثیہ : ۲۳)	فی سابق علمه [۱۶]
۱۷- لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ	(الحجرات : ۱)	لا تقولوا خلاف الکتاب والسنة [۱۷]
۱۸- بِرُكْنِهِ	(الذاریات : ۳۹)	بقوته [۱۸]
۱۹- سَنَفْرُغُ لَكُمْ	(الرحمن : ۳۱)	هذا وعید من الله لعباده ولیس بالله شغل [۱۹]
۲۰- الْحَافِرَةِ	(النازعات : ۱۰)	الحیاة [۲۰]
۲۱- لن يَحُورَ	(الانشقاق : ۱۴)	لن یبعث [۲۱]
۲۲- ضَرِيعٍ	(الغاشیہ : ۶)	شجر من نار [۲۱]

(۲۳) الاتقان کی ۳۷ ویں نوع قرآن مجید کے ان الفاظ کے بارے میں ہے جو اہل حجاز کے لہجہ کی بجائے دوسرے لہجات سے ماخوذ ہیں۔ (۱ : ۱۳۵)

حاشیۂ فراہی:

فیه اکاذیب (۱ : ۱۶۵) اس باب میں بڑے جھوٹ ہیں۔

(۲۴) قرآن مجید میں معرب الفاظ کے وجود کی حکمت بیان کرتے ہوئے امام سیوطی لکھتے ہیں کہ قرآن چونکہ اولین و آخرین کے علوم پر مشتمل ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس میں مختلف زبانوں اور لہجات کی جانب اشارہ ہو تاکہ ہر چیز کا احاطہ ہو سکے۔ چنانچہ ہر زبان سے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا گیا جو عربوں کے لیے نہایت شیریں، ہلکے اور کثیر الاستعمال ہوں۔ پھر میں نے دیکھا کہ ابن النقیب نے اس کی صراحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "دوسری کتب سماویہ پر قرآن کا امتیاز یہ ہے کہ دوسری کتابیں جس قوم پر نازل ہوئیں اسی کی زبان میں نازل ہوئیں دوسری زبان کا کوئی لفظ ان میں نہیں آیا۔ اس کے برخلاف قرآن مجید عربوں کے تمام لہجات نیز غیر عربوں مثلاً روم و ایران اور حبشہ کی زبانوں کے بھی بہت سارے الفاظ پر مشتمل ہے۔" ابن النقیب کا قول نقل کرکے سیوطی اس پر مزید اضافہ کرتے ہیں: نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہر قوم کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ ... ہم نے ہر رسول کو اسی کی قوم کی زبان میں بھیجا۔

(ابراھیم : ۴)

پس لازم ہے کہ آپ کے ساتھ جو کتاب بھیجی گئی اس میں ہر قوم کی زبان کا حصہ ہو اگرچہ اصلاً آپ کی قوم کی زبان میں ہو۔ (۱ : ۱۴۸)

حاشیۂ فراہی :

أخطأ وابن النقیب أکبر منه خطأً قوله : "وایضا" إلی آخره فی غایة الوهن ۔ (۱ : ۱۶۸)

سیوطی نے غلطی کی اور ابن النقیب کی غلطی اس سے بھی بڑی ہے۔ سیوطی کا قول جو "نیز" سے شروع ہوتا ہے آخر تک بے حد کمزور ہے۔

(۲۵) وجوہ و نظائر کی بحث میں لفظ "ہدیٰ" کے سترہ (۱۷) معانی ذکر کیے ہیں۔ (۱ : ۱۸۱)

حاشیۂ فراہی :

فی هذه الوجوه ما لیس منها وما هو داخل فی غیرها. (۱ : ۱۸۵)

ان وجوہ میں سے بعض تو درحقیقت خارج ہیں اور بعض وجوہ دوسرے وجوہ میں داخل ہیں۔[1]

(۲۶) لفظ "ہدیٰ" کے مذکورہ معانی میں ایک معنی "توبہ" کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی مثال میں آیت کریمہ 'انّا هُدْنَا إِلَيْكَ' پیش کی ہے۔ (۱ : ۱۸۶)

حاشیۂ فراہی :

اخطأ فیما جعل "هُدْنَا إِلَيْكَ" من الهدی فانما هو من "الهود"

"ہدنا الیک" کو "ہدیٰ" سے ماخوذ بتایا ہے جو غلط ہے۔ اس کا ماخذ "ہود" ہے[2]۔ غالباً سہواً

۱۔ مولانا فراہی نے لفظ "ہدیٰ" کے لغوی وجوہ چار لکھے ہیں۔ دیکھیے مفردات القرآن : ۲۰۔

۲۔ یہ نقل در نقل کی ان حیرت انگیز مثالوں میں سے ایک ہے جو خاص طور پر تفسیر کی کتابوں میں جابجا نظر آتی ہیں۔ لفظ "ہدیٰ" کے یہ سترہ (۱۷) وجوہ اس فن کی موجود قدیم ترین کتاب (الاشباہ والنظائر) مصنفہ مقاتل بن سلیمان بلخی متوفی ۱۵۰ھ (۸۹ - ۹۵) میں اسی طرح ملتے ہیں۔ "ھدنا" کو اس میں بھی ہدیٰ کے ذیل میں لکھا گیا ہے۔ اس سے قدیم ترین کتاب اس فن پر موجود نہیں کہ یہ سراغ لگ سکے کہ یہ مقاتل کی غلطی ہے یا انھوں نے بھی کسی سے نقل کیا ہے۔ بہرحال یہی سترہ (۱۷) وجوہ بشمول "ہدنا" التصاریف (۹۹ : ۱۰۳) الدامغانی (۴۷۳ - ۴۷۶) زرکشی (۱۰۲ : ۱) پھر سیوطی کے یہاں نقل ہوئے۔ البتہ ابن الجوزی (نزہہ : ۶۲۹ : ۶۳۰) نے "ہدیٰ" کے ۲۴ وجوہ نقل کیے ہیں۔ مگر ان میں

واصله من السهو فان عدد ۱۷ یتم بدونه (۱ : ۱۸۵)

اس لیے کہ ۱۷ کی تعداد اس کے معنی کے بغیر مکمل ہو جاتی ہے۔[1]

(۲۷) ابن ابی حاتم نے عکرمہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "دین" کا لفظ قرآن مجید میں جہاں بھی آیا ہے حساب کے معنی میں ہے۔ (۱ : ۱۸۸)

حاشیۂ فراہی :

هذا لا یصح ، فانه قال تعالی:

یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ہدنا" کا ذکر نہیں ہے۔ انھوں نے اس فن پر لکھنے والوں پر سخت تنقید بھی کی ہے (۴۴) جب زرکشی اور سیوطی جیسے علماء کو اس غلطی پر تنبہ نہ ہوا تو اگر الاشباہ والنظائر، التصاریف اور البرہان والاتقان کے محققین کی نگاہ اس پر نہ گئی تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔

۱۔ ہمارے گذشتہ حاشیہ میں آپ نے دیکھا کہ یہ سترہ معانی جن میں "ہدنا" شامل ہے، قدیم کتابوں سے منقول ہیں۔ بالکل یہی حال سیوطی کی نہیں ہے۔ البتہ پہلا معنی "ثبات" زائد ہے۔ سیوطی نے اس کی مثال 'اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ' لکھی ہے۔ دوسروں کے یہاں یہ آیت "ارشاد" کی مثالوں میں مذکور ہے۔ (التصاریف : ۱۰۰ زرکشی ۱ : ۱۰۲) اب اگر سیوطی نے اس معنی کا شروع میں اضافہ کیا تھا تو تعداد اٹھارہ لکھنی تھی۔ یا بعد کے مذکورہ معانی میں سے کسی کو حذف کرنا تھا۔ اس موقع پر الاتقان کے محقق نے (۲ : ۱۴۵) متن میں ترمیم کی اور سبعة عشر (۱۷) کی جگہ "تسعة عشر" (۱۹) درج کر دیا۔ حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ مخطوطات میں "سبعة" ہے مگر ہم نے جو درج کیا ہے وہ مذکورہ وجوہ اور ان کی مثالوں کے مطابق ہے۔ موصوف نے عجلت سے کام لیا۔ غالباً انھوں نے دیکھا کہ وجوہ کی تعداد (۱۸) (ثمانیة عشر) ہے تو پریشانی ہوئی۔ ان کے ذہن میں آیا کہ "سبعة" - "ثمانیة" کی تصحیف تو ہو نہیں سکتی، البتہ "تسعة" کی تصحیف آسانی سے ہو سکتی ہے۔ انھوں نے مخطوطات کی تحقیق میں اس کی بہت سی مثالیں دیکھی ہوں گی۔ چنانچہ دوبارہ شمار کرنا شروع کیا، تو ایک معنی رسل و کتب، نظر آیا بس اسی کو ایک کے بجائے دو شمار کر لیا اور اس طرح ۱۹ کی تعداد مکمل ہو گئی۔ موصوف نے اتنی زحمت اگر اور کی ہوتی کہ زرکشی کی البرہان دیکھ لیتے جو الاتقان کا ماخذ بھی ہے اور اتفاقاً سے قبل خود اس کی تحقیق کر چکے ہیں تو معلوم ہوتا کہ زرکشی نے یہی سترہ (۱۷) وجوہ لکھے ہیں اور ان میں پانچواں معنی "الرسل والکتب" ہے۔ وہاں موصوف نے کوئی حاشیہ نہیں لکھا۔ جب کہ ان کے نزدیک ان وجوہ کی تعداد اٹھارہ (۱۸) ہونی چاہیے۔ نیز دیکھیے وجوہ و نظائر کی مذکورہ مثالیں۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا — اللہ نے تم لوگوں کے لیے وہی دین مقرر کیا جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا

(الشوریٰ : ۱۳)

وایضا : — نیز فرمایا :

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ — بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اس دین کو منتخب کیا ہے۔

(البقرۃ : ۱۳۲)

وایضا : — نیز فرمایا :

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ — بلاشبہ اللہ کے نزدیک اصل دین صرف اسلام ہے

(آل عمران : ۱۹)

وھذا کثیر (۱:۱۸۸) — اور اس کی مثالیں بہت ہیں۔

(۲۸) حروف وادوات کی بحث میں آیتِ کریمہ :

وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ — اور بے شک ہم یا تم ضرور راہِ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں ہیں۔

(سبا : ۲۴)

میں "علیٰ" اور "فی" کے موقع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں : "علیٰ" کو حق کے لیے اور "فی" کو گمراہی کے لیے استعمال کیا گیا اس لیے کہ صاحبِ حق گویا بلندی پر ہوتا ہے جس کی طرف چاہے نظر دوڑائے۔ اس کے برخلاف صاحبِ باطل کا حال یہ ہوتا ہے کہ جیسے تاریکی میں غرق ہو اور پستی میں ہو۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کس طرف کا رخ کرے (۱ : ۱۹۰)[1]

حاشیۂ فراہی :

أحسن — خوب کہا۔

(۱ : ۱۷۹)

(۲۹) حرف "إنْ" کے معانی میں ایک معنی "تعلیل" ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ علمائے کوفہ کا قول ہے ان کے نزدیک آیاتِ ذیل :

---

[1] یہ تشریح الکشاف (۳ : ۲۸۹) سے ماخوذ ہے۔ ابوحیان نے بھی البحر المحیط (۷ : ۲۸۰) میں بلا حوالہ نقل کیا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ — اور اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

(المائدۃ : ۵۷)

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ — بے شک اللہ نے چاہا تو تم مسجدِ حرام میں ضرور داخل ہوگے امن کے ساتھ۔

(الفتح : ۲۷)

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ — اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہوگے۔ (تدبر)[1]

(آل عمران : ۱۳۹)

اور اس طرح کے دوسرے مقامات پر جہاں فعل کا وقوع یقینی اور قطعی ہے یہی معنی مراد ہے۔ امام سیوطی لکھتے ہیں کہ جمہور نے آیتِ مشیت کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ بندوں کی تعلیم کے لیے ہے کہ مستقبل کی خبر دینے میں یہ اندازِ گفتگو ہونا چاہیے۔ دوسرا جواب یہ دیا کہ "ان شاء اللہ" اصلاً شرط ہے۔ پھر تبرک کے لیے استعمال ہونے لگا تیسرا جواب یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم سب لوگ مسجدِ حرام میں داخل ہوگے۔ اگر اللہ نے چاہا کہ دخول سے قبل تم میں سے کسی کی موت نہ ہو[2] باقی آیات میں یہ جواب دیا کہ وہاں یہ شرط ابھارنے کے لیے ہے جیسے تم اپنے بیٹے سے کہو کہ اگر تم میرے بیٹے ہو تو میری اطاعت کرو[3] (۱ : ۲۰۲)

حاشیۂ فراہی :

جواب الجمهور ليس بشيئ (۱ : ۱۹۱) — جمہور کا جواب بے وقعت ہے۔

(۱ : ۱۹۱)

(۳۰) حرف جر "فی" کے معانی میں ایک معنی یہ لکھا ہے کہ "عن" کے مترادف ہوتا ہے[4]۔ مثال میں آیتِ کریمہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے الانصاف، المسئلۃ ۸۸ (۲ : ۶۳۳) سیوطی کا ماخذ المغنی (۳۹ - ۴۰) ہے۔ ابوحیان (۳ : ۳۹، ۸ : ۱۰۱) نے لکھا ہے کہ مقاتل بن سلیمان اور ابوعبیدہ کے نزدیک بھی "إن" اسی معنی میں آتا ہے۔

[2] یہ تیسرا جواب ابوحیان (۸ : ۱۰۱) اور قرطبی (۱۹ : ۲۹) نے الحسین بن الفضل البجلی (۱۷۸ : ۲۸۲ھ) سے نقل کیا ہے۔ موصوف کا نام ابوحیان اور زرکشی (۱ : ۳۸۶) میں "الحسن" ہے جو صحیح نہیں۔

[3] ابوحیان (۲ : ۲۷۸)

[4] یہ معنی زمخشری، ابوحیان، ابن ہشام کسی نے نہ لکھا۔ امام سیوطی کو آیت مذکورہ کی بعض تفسیروں سے غلط فہمی ہوئی

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا
(الاسراء: ۷۲)

اور جو اس دنیا میں اندھا بنا رہے گا وہ آخرت میں بھی اندھا اور گمراہ تر ہوگا۔
(تدبر)

پیش کی ہے اور تشریح یہ کی ہے کہ آخرت اور اس کے محاسن سے اس کی آنکھیں محروم ہیں۔[۱]

حاشیۂ فراہی :

فیہ نظر
(۱ : ۲۰۵)

یہ محل نظر ہے۔

(۳۱) لفظ "کل" کے استعمال کے سلسلہ میں علمائے بلاغت کا قول نقل کیا ہے کہ اگر لفظ "کل" نفی کے حیز میں ہو یعنی اس سے قبل ادات نفی یا فعل منفی ہو تو صرف عموم کی نفی ہوگی اور مفہوم مخالف سے بعض افراد کے لیے فعل کا ثبوت ہوگا۔ پھر اس قاعدہ کی بنیاد پر آیت کریمہ :

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ
(الحدید : ۲۳)

اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔

کا اشکال بیان کیا ہے۔ اس لیے کہ اس قاعدہ کی رو سے بعض افراد کے لیے جن میں مذکورہ صفات میں سے کوئی صفت موجود ہو، اللہ تعالیٰ کی محبت کا ثبوت صحیح ہوگا۔[۲] پھر یہ بھی لکھا ہے کہ اس اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ مفہوم مخالف کی دلالت اسی وقت معتبر ہوتی ہے جب کوئی معارض نہ ہو اور یہاں معارض موجود ہے اس لیے کہ دلیل سے معلوم ہے کہ فخر و عزور مطلقاً حرام ہے۔ (۱ : ۲۲۰)

---

٢ من عمی عن قدرة الله فی الدنیا فهو فی الآخرة أعمی (طبری ۱۵ : ۱۲۸)
ہے۔ حالانکہ ان کے اصول کے مطابق ابن ابی طلحہ کی روایت سے انہیں تجاوز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کے الفاظ ہیں:
یعنی جیسے دنیا میں اللہ کی قدرت نظر نہ آئی وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔"
اس تفسیر کی رو سے دونوں جگہ (فی الدنیا ۔ ۔ ۔ فی الآخرہ) "فی" "ظرفیت" کے لیے ہے۔

۱۔ قرطبی ۱۰ : ۲۹۸

۲۔ مذکورہ قاعدہ کی رو سے ترجمہ یہ ہوگا :
"اور اللہ ہر اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔"
گویا کوئی اترانے والا شیخی باز ایسا بھی ہو سکتا ہے جسے اللہ پسند کرے۔ یہی اشکال ہے۔

حاشیۂ فراہی :

لا معول علی ما زعم من الاشکال
(۱ : ۲۰۸)

جس اشکال کا دعویٰ کیا ہے وہ ناقابل اعتماد ہے۔[۱]

(۳۲) الاتقان کی ۴۲ ویں نوع ان اہم قواعد پر مشتمل ہے جن کی مفسر کو ضرورت ہے۔ پہلا قاعدہ ضمائر کے باب میں ہے۔ (۱ : ۲۴۴)

حاشیۂ فراہی :

باب الضمائر مهم جدا (۱ : ۲۳۱)

ضمائر کا باب بہت اہم ہے۔

(۳۳) امام سیوطی لکھتے ہیں کہ کبھی ضمیر مثنیٰ ہوتی ہے اور مرجع مذکورہ دونوں چیزوں میں سے ایک ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ
(الرحمٰن : ۲۲)

ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے۔

ضمیر "ھما" مثنیٰ ہے جب کہ لولو اور مرجان صرف ایک قسم کے (یعنی کھاری) سمندر سے نکلتے ہیں۔[۲] (۱ : ۲۴۵)

۱۔ مولانا نے نفی کا ایک اسلوب یہ ذکر کیا ہے کہ کبھی منفی کے ضد کا اثبات مراد ہوتا ہے۔ "لا یحب" (پسند نہیں کرتا) "یبغض" (ناپسند کرتا ہے) کے معنی میں آتا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ اس کی مثالیں بہت ہیں۔ مفردات القرآن : ۶۳ ۔ اسالیب القرآن : ۴۴)

۲۔ مجاز القرآن ۲ : ۲۴۴، معانی القرآن ۳ : ۱۱۵ ۔ امام طبری نے اس قول کی تردید کی ہے اور خود "البحرین" سے مراد "بحر السماء و بحر الارض" (آسمان کا سمندر اور زمین کا سمندر) لیا ہے۔ چونکہ موتی بارش کے قطروں سے صدف میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے "آسمان و زمین دونوں کے سمندروں" سے پیدا ہوئے۔ گویا ضمیر مرجع کے مطابق مثنیٰ ہوئی۔ یہی تفسیر مجاہد اور سعید بن جبیر سے منقول ہے (طبری ۲۷ : ۱۳۲) لیکن حافظ ابن کثیر نے (۶ : ۴۶۸) اس تفسیر کو اختیار نہیں کیا۔ ان کے نزدیک "البحرین" سے مراد میٹھا اور کھاری پانی ہی ہے۔ "منھما" کی تفسیر "من مجموعھما" کی ہے یعنی میٹھا اور کھاری فرداً فرداً مراد نہیں ہے۔ چنانچہ اگر ایک ہی قسم سے موتی اور مونگا نکلتا ہو تو کافی ہے۔ نظیر میں سورہ الانعام : ۱۳۰ کی یہ آیت پیش کی ہے :

حاشیۂ فراہی :

لم یصب (۱ : ۲۳۱) — صحیح نہیں کہا۔[1]

(۳۴) لکھتے ہیں کہ کبھی ضمیر سے متصل کوئی چیز ہوتی ہے مگر مرجع دوسرا ہوتا ہے مثلاً آیتِ کریمہ :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ — اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا۔

میں آدم مراد ہیں پھر بعد کی آیت :

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً — پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا۔

(المومنون : ۱۲ - ۱۳)

میں ضمیر (ہ) آدم کی اولاد کے لیے استعمال کی گئی۔ (۱ : ۲۳۵)[2]

= يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ — اے گروہ جن وانس کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول نہیں آئے۔

خطاب جن وانس دونوں سے ہے مگر رسول صرف انسانوں میں آئے۔

سورہ فاطر : ۱۲ کی بھی آیت پیش کی ہے :

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا — اور دونوں دریا برابر نہیں ہیں ایک تو شیریں پیاس بجھانے والا ہے جس کا پینا آسان ہے اور ایک شور تلخ ہے اور تم ہر ایک سے تازہ گوشت کھاتے ہو نیز زیور (یعنی موتی) نکالتے ہو جس کو تم پہنتے ہو۔ (تھانوی)

ابن کثیر کہتے ہیں :

"گوشت تو شور وشیریں دونوں سے نکلتا لیکن زیور صرف شور سے نکلتا ہے۔ شیریں سے نہیں"۔

۱۔ تدبر قرآن (۶ : ۳۵۱) میں انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مقالہ (PEARL) سے نقل کیا ہے :

"نصف کرہ شمالی کے منطقہ معتدلہ میں میٹھے پانی سے سیپ کے کیڑے بہت قیمتی موتی پیدا کرتے رہے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے میٹھے پانی سے موتی زیادہ تر دریائے مس سس پی سے نکلتے ہیں۔۔۔۔ چین میں میٹھے پانی سے موتی نکالنے کی صنعت ہزار برس قبل مسیح سے معروف ہے"۔

۲۔ البحر المحیط ۶ : ۳۹۸

حاشیۂ فراہی :

لم یصب، فإن المراد بالانسان نوعه وكل ما يجرى على بعض النوع ينسب إلى النوع (۱ : ۲۳۲) — صحیح نہیں کہا۔ اس لیے کہ انسان سے مراد نوع انسان ہے اور وہ تمام حالات جو نوع کے کسی فرد کو پیش آئیں ان کی نسبت نوع کی جانب کی جائے گی۔[1]

(۳۵) ضمائر کے سلسلہ میں ایک قاعدہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اصل یہ ہے کہ ضمائر کا مرجع ایک ہو تاکہ کلام انتشار کا شکار نہ ہو۔ (۱ : ۲۴۵)

حاشیۂ فراہی :

أصل مهم فى اختلاف المرجع (۱ : ۲۳۲) — اختلاف مرجع کے باب میں ایک اہم اصول۔

(۳۶) گذشتہ اصول بیان کرنے کے بعد سیوطی لکھتے ہیں کہ اسی وجہ سے آیتِ کریمہ :

اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ (طٰہٰ : ۳۹) — کہ ان کو ایک صندوق میں رکھو پھر ان کو دریا میں ڈال دو۔ (تھانوی)[2]

میں بعض علماء نے جب پہلی ضمیر کا مرجع حضرت موسیٰ اور دوسری کا تابوت بنایا تو زمخشری نے اسے معیوب قرار دیا اور لکھا کہ ساری ضمیریں موسیٰ کی جانب لوٹتی ہیں۔ بعض کا مرجع موسیٰ ہوں اور بعض کا تابوت یہ نقص ہے جس سے نظم میں تنافر پیدا ہوتا ہے اور نظم اعجاز قرآن کی اساس ہے۔ (۲ : ۲۴۵)[3]

۱۔ الکشاف ۳ : ۲۷

۲۔ ابوحیان (۶ : ۲۴۱) نے یہ قول ابن عطیہ سے نقل کیا ہے۔

۳۔ الکشاف ۲ : ۵۳۶

حاشیۂ فراہی :

لم یصب الزمخشری فی اطلاقه ولکنه	زمخشری کا اسے مطلق عیب قرار دینا صحیح نہیں
اراد مواضع خالیة عن القرینة	لیکن ان کی مراد ان مقامات سے ہے جہاں کوئی
(۱ : ۲۳۲)	قرینہ نہ ہو۔

(۳۷) اختلاف مرجع کے باب میں مذکورہ قاعدہ سے مستثنیٰ چند مثالیں ذکر کرتے ہوئے آیت کریمہ:

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ	اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے
بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا	تو وہ ان کی وجہ سے مغموم اور ان کے سبب
(ھود : ۷۷)	تنگ دل ہوئے۔

کی تفسیر ابن عباسؓ سے یہ نقل کی ہے:

ساء ظنا بقومه وضاق ذرعا	اپنی قوم سے بدگمان اور اپنے مہمانوں کے
باضیافه	سبب تنگ دل ہوئے۔

یعنی پہلی ضمیر (ھم) کا مرجع "قوم" اور دوسری کا "رسل" (۱ : ۲۴۶)[1]

حاشیۂ فراہی :

لا یصح ما روی عن ابن عباس (۱ : ۲۳۲)	ابن عباس سے یہ روایت صحیح نہیں۔

---

1 یہ تفسیر علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ سیوطی کے اصول کے مطابق اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ یہاں انھوں نے اسی اصول پر عمل کیا ہے۔ مگر جلالین (۲۹۶) میں خود انہیں یاد نہ رہا اور دہی تفسیر کی جو سب کرتے آئے۔ حیرت یہ ہے کہ طبری نے تفسیر تو یہ کی (۱۲ : ۸۱) :

" ولما جاءت ملائکتنا لوطا ساءه مجیئهم وضاق بهم (بمجیئهم) ذرعا یقول : ضاقت نفسه غمًا بمجیئهم۔"

اور تائید میں حضرت ابن عباس کی مذکورہ روایت پیش کی : حافظ ابن کثیر (۴ : ۲۹۷) قرطبی (۹ : ۴۴) شوکانی (۲ : ۵۱۳) کسی نے بھی اس روایت کی جانب اشارہ تک نہ کیا! یہی صورت ابوحیان اور زمخشری کے یہاں بھی ہے۔ گویا طبری سے لے کر شوکانی تک یہ تفسیر یکساں طور پر متنوع رہی۔ سیوطی نے الدر المنثور (۳ : ۳۴۲) میں ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل نہیں کی البتہ یہی قول قتادہ کی جانب منسوب کیا ہے۔

(۳۸) ضمیروں کے سلسلہ میں ایک قاعدہ یہ لکھا ہے کہ اگر مرجع غیر عاقل کی جمع ہو تو جمع کثرت میں ضمیر مفرد اور جمع قلت میں جمع لائی جاتی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ فراء نے اس قاعدہ میں ایک لطیف نکتہ ذکر کیا ہے۔ وہ یہ کہ چونکہ جمع کثرت یعنی دس سے زائد کی تمیز مفرد ہوتی ہے، اس لیے ضمیر مفرد لائی گئی۔ اور جمع قلت یعنی دس اور اس سے کم کی تمیز چونکہ جمع ہوتی ہے اس لیے ضمیر بھی جمع لائی گئی۔ (۱ : ۲۴۷)[1]

حاشیۂ فراہی :

۱. مولانا فراہی نے پہلے اس قاعدہ کے عنوان کے طور پر لکھا ہے :

وحدة الضمیر المؤنث وجمعه	مرجع غیر عاقل کی جمع ہو تو مونث ضمیر کے مفرد
إذا کان المرجع جمع غیر العاقل	اور جمع لانے کا موقع۔

۲. پھر فراء کے قول پر لکھا ہے :

أصاب الفراء وأحسن (۱ : ۲۳۳)	فراء نے صحیح کہا اور خوب کہا۔

(۳۹) ضمیروں کے باب میں ایک اور قاعدہ یہ لکھا ہے کہ جب ضمائر میں لفظ و معنی کی رعایت ممکن ہو تو پہلے لفظ کی رعایت ہوتی ہے پھر معنی کی۔ قرآن مجید کا اسلوب یہی ہے (۱ : ۲۴۷)

حاشیۂ فراہی :

أصل مهم فی اختلاف الضمائر	اتحاد مرجع کے وقت ضمیر کے اختلاف کے باب
مع اتحاد المرجع (۱ : ۲۳۳)	میں ایک اہم اصول۔

(۴۰) قاعدہ.... ذکر کرنے کے بعد سیوطی نے شیخ علم الدین عراقی سے نقل کیا ہے کہ لفظ کے بجائے معنی کی رعایت سے ابتداء قرآن مجید میں صرف ایک جگہ آیت ذیل میں آئی ہے۔

وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ	اور وہ کہتے ہیں کہ جو چیز ان مواشی کے پیٹ میں
لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا	ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے اور
(الانعام : ۱۳۹)	ہماری عورتوں پر حرام ہے۔ (تھانوی)

اس آیت میں "ما" کے معنی کی رعایت میں "خالصة" کو مونث لائے، پھر لفظ کی رعایت میں

---

1 معانی القرآن ۱ : ۴۳۵

"محرم" کو مذکر استعمال کیا۔ (۱ : ۲۴۷)[1]

حاشیۂ فراہی :

لیس کماظن۔ فإن التاء فی "خالصة" لیست للتانیث۔ فإن مافی البطون غیر مختص بالمؤنث۔ فلا حمل علی اللفظ بعد الحمل علی المعنی (۱ : ۲۳۳)

شیخ عراق کا قول صحیح نہیں۔ اس لیے کہ "خالصة" میں (ت) تانیث کی نہیں ہے۔ کیونکہ پیٹ میں جو کچھ ہے وہ سب مؤنث نہیں۔ پس یہاں رعایتِ معنی کے بعد رعایت لفظ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔[2]

(۴۱) ابن جنی کی کتاب (المحتسب) سے نقل کیا ہے کہ رعایت ۔۔۔ معنی کے بعد دوبارہ لفظ کی رعایت جائز ہے[3] اور دلیل میں یہ آیت پیش کی ہے :

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ۔ وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ

اور جو شخص خدا کے ذکر سے اعراض کرتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور وہ ان کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہدایت پر ہیں۔

پھر فرمایا :

حَتّٰى إِذَا جَاءَنَا

یہاں تک کہ جب ہمارے پاس آئے گا۔

(الزخرف : ۳۶ - ۳۸) (تدبر)

"یعش" میں لفظ "من" کی رعایت میں ضمیر مفرد کی استعمال پھر "انہم" میں معنی کی رعایت میں جمع "ھم" لائے۔ پھر "جاء" میں دوبارہ لفظ کی رعایت میں ضمیر مفرد استعمال کی۔ (۱ : ۲۴۷)

---

[1] ابوحیان (۴ : ۲۳۲) نے یہ قول اپنے شیخ علم الدین عراقی سے نقل کیا ہے پھر لکھا ہے کہ یہ مکی بن ابی طالب کا قول ہے۔

[2] امام طبری (شاکر ۱۲ : ۱۴۸ - ۱۴۹) نے بعض کوفی نحویوں سے نقل کیا ہے کہ "خالصة" کو "الانعام" کی رعایت سے مونث لائے ہیں۔ ایک قول یہ بھی لکھا ہے کہ "خالصة"، "عاقبة" اور "عافیة" کی طرح مصدر ہو سکتا ہے مگر ترجیح اسے دی ہے کہ "خالصة" میں "ت" مبالغہ کی ہے تانیث کی نہیں۔

[3] مولانا کے ایڈیشن میں عبارت یوں ہے :

حاشیۂ فراہی :

لم یصب ابن جنی۔ فإن الآیة لیس فیھا اتحاد المرجع، فإن قوله تعالی (وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ) بیان الجماعة و قوله تعالی (ومن یعش) ھو بیان الافراد فردا فردا ای کل غافل عن ذکر الرحمٰن له قرین۔ ثم دل ذٰلك علی جماعة القرناء فرجع ضمیر الجمع إلی ھذا المفھوم فافھم۔ (۱ : ۲۳۳)

ابن جنی نے صحیح نہیں کہا۔[1] اس لیے کہ آیت میں مرجع ایک نہیں ہے۔ ارشاد باری "وانھم لیصدونھم" میں جماعت کا ذکر ہے اور "من یعش" میں افراد کا فرداً فرداً بیان ہے۔ یعنی ذکرِ الٰہی سے غافل ہر شخص کا ایک ساتھی ہے۔ اس سے پتہ چلا کر ساتھیوں کی ایک جماعت ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ضمیر جمع کی استعمال کی۔ اسے خوب سمجھ لو۔

(۴۲) ایک شاذ قراءت "قل ھو اللہ أحد اللہ الواحد الصمد" درج کی ہے کہ یہ قراءت ابوحاتم نے کتاب الزینہ میں حضرت جعفر الصادق سے نقل کی ہے۔ (۱ : ۲۵۰)[2]

حاشیۂ فراہی :

لیس بقراءة۔ إنما تفسیر (۱ : ۲۳۶)

یہ قراءت نہیں بلکہ تفسیر کی ہے۔

(۴۳) ابن ابی حاتم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ قرآن میں جہاں بھی لفظ "ریاح"

= "قال ابن جنی فی المحتسب: یجوز مراجعة اللفظ بعد انصرافه عنه إلی المعنی، وأورد علیه قوله تعالی ۔۔۔"

چونکہ مولانا کا حاشیہ اسی عبارت پر ہے اس لیے ہم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ لیکن اس عبارت میں "یجوز" سے قبل "لا" چھوٹ گیا ہے۔ عام ایڈیشن (۱ : ۲۴۷) اور تحقیقی ایڈیشن (۲ : ۳۴۳) میں صحیح "لایجوز" چھپا ہے۔ اب "أُورِدَ" کو مجہول پڑھیں گے اور ترجمہ یہ ہوگا : "ابن جنی نے کتاب المحتسب میں لکھا ہے کہ رعایت معنی کے بعد دوبارہ لفظ کی رعایت جائز نہیں (ابن جنی کی) اس (رائے) پر اعتراض کے طور پر یہ آیت پیش کی گئی ہے۔

[1] اب "ابن جنی" کے بجائے مولانا کے حاشیہ میں "ابن جنی پر اعتراض کرنے والے" ہونا چاہیے۔

[2] کتاب الزینہ ۲ : ۳۹

(بصیغۂ جمع) ایک ہے رحمت کے لیے استعمال ہوا ہے، اور "ریح" (بصیغۂ مفرد) عذاب کے لیے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے: "اللھم اجعلھا ریاحا ولا تجعلھا ریحا" (۲: ۲۵۲)

حاشیۂ فراہی:

لا یصح ھذا الحدیث	یہ حدیث صحیح نہیں۔[۱]

(۴۴) متشابہات کے سلسلہ میں جمہور کا مسلک یہ ہے کہ ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے چنانچہ آیت کریمہ:

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ	حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں
فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ	جانتا، تو جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں
(آل عمران: ۷)	کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ (تدبر)

میں "الراسخون" سے نیا جملہ شروع ہوتا ہے لیکن بعض حضرات کے نزدیک "الراسخون" کا عطف "اللہ" پر ہے۔ چنانچہ سیوطی لکھتے ہیں کہ امام نووی نے اسی قول کو نقل کیا ہے۔ شرح مسلم میں لکھتے ہیں: یہی ارجح ہے۔ اس لیے کہ یہ بعید از عقل بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کوئی ایسی بات کہے جس کا سمجھنا کسی شخص کے لیے ممکن نہ ہو۔ ابن حاجب کے نزدیک بھی یہی "ظاہر" ہے۔ (۲: ۴)

حاشیۂ فراہی:

اخطأ النووی و ابن حاجب فیما	نووی اور ابن حاجب نے سلف سے اس
خالفا به السلف (۲: ۳)	اختلاف میں غلطی کی۔

(۴۵) سیوطی اس مسئلہ میں جمہور کے مسلک کی تائید میں لکھتے ہیں: اس رائے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آیت میں متشابہ کی پیروی کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے اور ان کے لیے "زیغ" اور "ابتغاء فتنہ" کی صفات استعمال کی گئی ہیں۔ نیز ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو علم کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرتے ہیں۔ اس طرح مومنین بالغیب کی مدح کی گئی ہے۔ (۲: ۴)

حاشیۂ فراہی:

۲۔ ملاحظہ ہو مجمع الزوائد ۱۰: ۳۵، المطالب العالیہ ۳: ۲۳۸

اخطأ فی تاویل المومنین بالغیب (۲: ۴)	مومنین بالغیب کی تاویل میں غلطی کی۔[۱]

(۴۶) سیوطی لکھتے ہیں: ابن ابی داؤد نے المصاحف میں اعمش کی روایت نقل کی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں ہے:

وإن تاويله إلا عند الله والراسخون في العلم يقولون آمنا به (۲: ۴)

حاشیۂ فراہی:

اخطأ فیما زعم من قراءة ابن	یہ گمان غلط ہے کہ یہ ابن مسعود کی قراءت ہے
مسعود انما ھو تفسیر منه (۲: ۳)	بلکہ یہ ان کی جانب سے آیت کی تفسیر ہے۔

(۴۷) اسی فصل میں سیوطی نے چند روایات "سبعۃ احرف" سے متعلق نقل کی ہیں۔ پہلی روایت حاکم کی ہے۔ (۲: ۵)

حاشیۂ فراہی:

روایات تدل علی تاویل سبعة	چند روایات جن سے سبعۃ احرف کی تاویل
احرف (۲: ۴)	معلوم ہوتی ہے۔

(۴۸) مفردات امام راغب سے نقل کیا ہے کہ آیات تین قسم کی ہیں۔ ایک قسم تو وہ جو علی الاطلاق محکم ہیں۔ دوسری جو علی الاطلاق متشابہ ہیں۔ تیسری ایک پہلو سے محکم اور ایک پہلو سے متشابہ پھر متشابہ کی قسمیں: لفظی، معنوی، لفظی و معنوی کی ہیں۔ (۲: ۶)[۲]

حاشیۂ فراہی:

أخطأ الراغب فیما أدخل فی	غیر متشابہ کو متشابہ میں داخل کرکے راغب نے
المتشابه ما لیس منه (۲: ۵)	غلطی کی۔

(۴۹) امام فخرالدین رازی کا قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں: لفظ کو راجح کے بجائے مرجوح معنی میں

۱۔ ملاحظہ ہو مولانا کی تفسیر سورہ بقرہ غیر مطبوعہ، تدبر قرآن ۱: ۹۰

۲۔ مفردات (شبہ): ۲۶۰

لینے کے لیے کوئی علیحدہ دلیل چاہیے۔ یہ دلیل لفظی ہوئی یا عقلی۔ اصولی مسائل میں لفظی کا اعتبار ممکن نہیں اس لیے کہ وہ قطعی نہیں ہوتی، کیونکہ قطعی ہونا موقوف ہے احتمالات عشرہ کے زائل ہونے پر، اور ان کا زائل ہونا ظنی ہے۔ ظنی پر جو چیز موقوف ہو وہ بھی ظنی ہوگی اور اصول میں ظنی پر اکتفا نہیں کیا جاتا۔

جہاں تک دلیل عقلی کا تعلق ہے تو وہ صرف اتنا فائدہ دیتی ہے کہ چونکہ معنی ظاہر محال ہے اس لیے لفظ کو اس پر محمول نہ کیا جائے۔ رہا معنی مراد کا اثبات تو یہ عقلاً ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اس کا طریقہ یہی ہوگا کہ ایک مجاز کو دوسرے مجاز اور ایک تاویل کو دوسری پر ترجیح دی جائے۔ یہ ترجیح دلیل لفظی ہی سے ممکن ہے اور دلیل لفظی ترجیح کے لیے ضعیف ہے اور صرف ظن کا فائدہ دیتی ہے۔ مسائل اصولیہ قطعیہ میں ظن پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ اس لیے سلف وخلف کے محققین کا مسلک یہ رہا ہے کہ اس بات پر دلیل قطعی قائم کر دی جائے کہ لفظ کو ظاہر پر محمول کرنا محال ہے اس کے بعد تاویل کی تعیین پر گفتگو نہ کی جائے۔ (۲ : ۷)

حاشیۂ فراہی :

أخطأ الإمام فيما جعل من المتشابه ما ليس منه (۲ : ۶)	غیر متشابہ کو متشابہ قرار دے کر امام نے غلطی کی۔

(۵۰) سیوطی نے اسی باب میں ایک فصل کی ابتداء یوں کی ہے کہ اوائل سور بھی متشابہ میں داخل ہیں۔ (۲ : ۸)

حاشیۂ فراہی :

أخطأ فيما زعم أن أوائل السور من المتشابه (۲ : ۱۰)	یہ دعویٰ کر کے غلطی کی کہ اوائل سور متشابہ میں داخل ہیں۔

(۵۱) اتقان کی ۴۴ ویں نوع قرآن مجید کے ان مقامات پر ہے جہاں مصنف کے بقول تقدیم و تاخیر ہوئی ہے۔ یعنی ایک چیز جو بعد میں آنی چاہیے تھی وہ پہلے آگئی اور پہلے والی بعد میں آئی۔ (۲ : ۱۷)

حاشیۂ فراہی :

كل ما ذكر فيه التقديم والتاخير ليس فيه تقديم ما حقه التاخير - (۲ : ۱۶)	ان سارے مقامات پر جہاں تقدیم و تاخیر کا ذکر کیا ہے کہیں بھی تقدیم ما حقہ التاخیر نہیں ہے۔ یعنی جس لفظ کا حق موخر ہونا تھا اسے مقدم کر دیا گیا ہو۔

(۵۲) کسی جگہ ایک لفظ کو مقدم اور دوسری جگہ اسی کو موخر کرنے کا ایک سبب تفنن کلام کا قصد بیان کیا ہے مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے :

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ (البقرۃ ۲ : ۵۸)	اور داخل ہو دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور دعا کرو کہ اے رب ہمارے گناہ بخش دے (تدبر)

دوسری جگہ ہے :

وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (الاعراف : ۱۶۱)	اور توبہ استغفار کرتے رہو اور دروازے میں سرافگندہ داخل ہو۔ (تدبر)

حاشیۂ فراہی :

لم يصب (۲ : ۱۹)	صحیح نہیں لکھا۔

(۵۳) عام وخاص کی بحث میں لکھا ہے کہ آیت کریمہ :

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء : ۵۴)	کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں اس فضل پر جو اللہ نے ان کو بخشا۔ (تدبر)

میں "الناس" سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں[۲]۔ اس لیے کہ آپ کے اندر وہ تمام اخلاق حمیدہ جمع ہیں جو الناس یعنی انسانوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔ (۲ : ۲۲)

حاشیۂ فراہی :

أخطأ (۲ : ۲۰)	غلطی کی۔

---

۱ ملاحظہ ہو مولانا کی تفسیر سورہ بقرہ (غیر مطبوعہ) تدبر قرآن ۱ : ۸۳ مولانا بدر الدین اصلاحی کا مضمون "حروف مقطعات" ماہنامہ الاصلاح جلد دوم شمارہ ۱۰ : ۶۱۱ - ۶۱۸

۲ یہی قول عکرمہ، سدی، مجاہد، ضحاک اور حضرت ابن عباس کی جانب منسوب ہے۔ قتادہ کے نزدیک الناس سے مراد قریش ہیں مگر امام طبری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو مراد لیا ہے (۸ : ۴۷۶)

(جاری ہے)

[بشکریہ ششماہی مجلہ علوم القرآن۔ علی گڑھ۔ بھارت۔ شمارہ جولائی۔ دسمبر ۱۹۸۵ء (جلد ۱ شمارہ ۱)]

امین احسن اصلاحی

اسلامی ارسٹوکریسی

سوال : آپ کی رائے میں مثالی سیاسی نظام کونسا ہے اور اس کا قیام کیونکر ممکن ہے ؟

جواب : انسانی معاشرہ اپنے ارتقاء کی آخری منزل کو پہنچ کر کسی نہ کسی سیاسی نظام کا تقاضا کرتا ہے جس کے ذریعے سے اس کے جملہ قومی امور انجام پا سکیں۔ اس نظام کی بہت سی شکلیں تجویز کی گئی ہیں جن میں سے بعض عملی ہیں اور بعض محض خیالی۔ پہلی قسم کے نظام تاریخ انسانی میں ہمیشہ جاری و ساری رہے ہیں اور آج بھی عملاً موجود ہیں، جیسے بادشاہت (MONARCHY) اور جمہوریت (DEMOCRACY) وغیرہ؛ جبکہ دوسری قسم کا وجود صرف سیاسی فلسفیوں، مثلاً افلاطون وغیرہ کے ہاں ملتا ہے۔ ان کی حیثیت محض ایک خیالی جنت (UTOPIA) کی ہے۔ ایسا نظام بالفعل کبھی قائم نہیں ہوا۔ ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ دیگر نظامہائے سیاسی کے بالمقابل صرف ارسٹوکریسی (ARISTOCRACY) یعنی اعیانیت ہی ایک عقلی نظام ہے جو بالفعل دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ ارسٹوکریسی سے مراد ایسا سیاسی نظام ہے جس کے تحت معاشرہ کے کسی نہ کسی پہلو سے ممتاز ترین اشخاص ایک سربراہِ مملکت کے زیر قیادت کاروبارِ حکومت کے لیے معتمد و مختار بنائے جاتے ہیں۔

دنیا میں کوئی سیاسی نظام بھی اپنے کامل معنوں میں مطلق بادشاہت یا صحیح جمہوریت یا کٹر مذہبی حکومت (THEOCRACY) کی شکل میں نہ کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان نظاموں کے کچھ نقوش ضرور موجود رہے ہیں۔ جہاں تک مطلق بادشاہت کا تعلق ہے، ماضی میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں، جیسے فراعنۂ مصر اور ملکۂ سبا کی حکومتیں۔ لیکن قدیم تاریخ کے مستند ترین ریکارڈ "قرآن مجید" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نوعیت بھی اعیانی یا شورائی تھی۔ سب حکمران کسی نہ کسی نوعیت کی اعیانیت کے سہارے زندہ اور اپنی حکومت چلاتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی مطلق العنان حیثیت کا مالک نہیں رہا۔ رہی جمہوریت (DEMOCRACY) تو اس کا خواہ مخواہ دعویٰ ہی کیا جاتا ہے کہ یہ عوام کی حکومت

ہے جو عوام کے ذریعے سے عوام کی بہبود کے لیے قائم ہوتی ہے۔ اپنی کامل شکل میں اس کا ظہور تا حال نہیں ہوا اور انسانی فطرت میں اس کا امکان بھی نہیں ہے۔ ہمارے دور کی جن جمہوریتوں کو آپ کچھ کامیاب کہہ سکتے ہیں ان کا مزاج بھی حقیقتہً شورائی ہی ہے۔ اسی لیے وہ زندہ بھی ہیں۔

ہمارے نزدیک ایک عقلی سیاسی نظام ارسٹوکریسی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ارسٹوکریسی کی بنیاد کس چیز پر ہوگی ؟ وہ کیا اساس ہوگی جس پر اعیانِ حکومت کا وجود ظہور میں آئے گا ؟ آیا وہ پیدائش ہے، شرافتِ نسبی ہے، مال ہے، دیگر انسانی اوصاف ہیں یا کوئی اور چیز ؟ دوسرے لفظوں میں آپ اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ارسٹوکریسی کی بنیاد ذات پات ہے، سرمایہ داری ہے، عقل و فلسفہ اور علم ہے یا کوئی اور چیز ؟ جہاں تک پہلی دو اساسات یعنی ذات پات اور سرمایہ کا تعلق ہے تو ان کی بنیاد پر وجود میں آنے والی ارسٹوکریسی ایک شیطنت ہوتی ہے۔ عقل و فلسفہ کی بنیاد پر قائم ہونے والی ارسٹوکریسی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ایک ایسی جنت ہے جس کی خیالی تصویر افلاطون اور ایسے ہی دوسرے فلسفیوں نے کھینچی ہے، لیکن بالفعل یہ نظام کبھی قائم نہیں ہوا ہے۔

ہماری رائے میں عقل یہ تقاضا کرتی ہے کہ ارسٹوکریسی یا اعیانیت کی بنیاد وہ لوگ ہونے چاہئیں جو اہلِ رائے اور اہلِ عقل ہوں۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کے لیے اہلِ استنباط ——— یعنی ایسے لوگ جو معاملے کی تہہ کو پہنچ جانے کی صلاحیت رکھتے ہوں ——— کا لفظ استعمال کیا ہے :

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى	اور اگر یہ اس کو رسول اور اپنے اولوالامر کے سامنے
اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ	پیش کرتے تو جو لوگ ان میں سے بات کی تہہ کو
يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ط	پہنچنے والے ہیں وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔
(النسآء — ۴ : ۸۳)	

گویا اعیانِ حکومت ایسے اہلِ علم اور اہلِ رائے ہوں کہ جب معاملات ان کے سامنے پیش ہوں تو وہ ان کو پوری طرح سے سمجھ سکیں، شواہد کی روشنی میں نتائج اخذ کر سکیں، جن معاملات کے لیے ان کے پاس صریح قانون موجود نہ ہو تو ان کو اصل مآخذ کی مدد سے قانون کا استخراج کر کے حل کر سکیں۔ ہمارے نزدیک تاریخ انسانی میں حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کی حکومتیں آئیڈیل ارسٹوکریسی کی بہترین مثال ہیں۔ یہی ارسٹوکریسی بعد میں سیدنا عمر بن عبدالعزیز علیہ الرحمۃ کے زمانے میں قائم ہوئی۔ ان مبارک ہستیوں کے قائم کردہ سیاسی نظام کو آپ اسلامی ارسٹوکریسی بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ بالکل صحیح اور فطری ارسٹوکریسی ہے۔ اسلامی ارسٹوکریسی کے تحت خلیفہ یا امیر کا انتخاب تو ضروری ہے کہ سب کے ووٹ سے ہو۔ البتہ سربراہِ مملکت اپنی

حکومت چلانے گا اعیان کے ذریعے سے اور اس کی حکومت شورائیت پر مبنی ہوگی۔

اس زمانے میں اگر اسلامی ارسٹوکریسی وجود میں آئے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اعیان کیسے تیار ہوں گے؟ دنیا میں کوئی نظام بھی خودکار نہیں ہوتا۔ نظام بہرحال انسانوں کو چلانا ہے، اللہ تعالیٰ کو تو اس کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ آدمیوں کو تیار کرے۔ اس کے لیے حکومت کو آئینی طور پر ایسے ادارے کا اہتمام کرنا ہوگا جو قوم کے اندر، ایک نظم کے تحت، بہترین اہل الرائے اور اہلِ استنباط کو پہچان جڑ جانے، ان کا انتخاب کرے اور ان کی باقاعدہ تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے۔ اس کی حیثیت ملک کے اعلیٰ ترین سیاسی کمیشن اور اکیڈمی کی ہوگی اور بڑی حد تک ایسے ہی ہوگی جیسے سی ایس ایس اور پی۔ سی۔ ایس۔ کے تحت تیار کیے جانے والے لوگوں کی ہوتی ہے۔ جس طرح مختلف امتحانات کے ذریعے سے قابل لوگ بیوروکریسی کے لیے منتخب کیے جاتے اور پھر مطلوبہ معیار کے حصول کے لیے ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے اسی طریقہ سے ایک نظم قائم کیا جا سکتا ہے جس کے تحت حکومت چلانے کے لیے وہ لوگ منتخب کیے جائیں جن کے اندر حکومت کا کاروبار چلانے کی صلاحیت پائی جائے۔ ان کی تربیت کے لیے حکومت مناسب انتظام کرے۔ اعلیٰ حکومتی عہدوں، جیسے پارلیمنٹ یا قانون ساز اداروں کی رکنیت یا وزارت کے لیے امیدوار ہر ایرا غیرا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ان کے انتخاب کی بنیادی اہلیت کے لیے اس اعلیٰ ترین سیاسی تربیتی ادارے کا سند یافتہ ہونا لازمی ہے۔ جس طرح سے عقل تقاضا کرتی ہے کہ غیر سند یافتہ ڈاکٹروں کو لوگوں کی صحت اور جان سے کھیلنے کا حق نہیں دیا جا سکتا' اسی طرح ایک سیاسی نظام، جس پر ایک قوم کی تمام تر فلاح و بہبود اور عروج و زوال کا دار و مدار ہوتا ہے، کو ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے لیے نہیں چھوڑا جا سکتا جو کاروبارِ حکومت کی ابجد سے بھی واقف نہ ہوں۔

یہ کام مشکل ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں۔ اگر آپ ایک آئیڈیل اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس کا اہتمام بہرحال کرنا پڑے گا۔ اس ادارے کے قیام کے بدون اور اس کے جملہ تقاضوں کو پورا کیے بغیر اسلامی ریاست کے قیام کے صرف خواب دیکھے جا سکتے ہیں، ان کی تعبیر ممکن نہیں ہے۔

(ترتیب : ماجد خاور)

تالیفاتِ امام حمید الدین فراہیؒ

	روپے پیسے
۱۔ مجموعہ تفاسیرِ فراہی :	۶۰-۰۰
۲۔ اقسام القرآن :	۵-۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے ؟	۵-۰۰

تالیفاتِ مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبرِ قرآن : (مکمل سیٹ : ۹ جلد) :	۷۲۰-۰۰
فی جلد :	۸۰-۰۰
۲۔ مبادیٔ تدبرِ قرآن :	۱۶-۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین :	۱۴-۰۰
۴۔ اسلامی ریاست :	۳۰-۰۰
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل :	۱۶-۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام :	۳-۰۰
۷۔ تنقیدات :	۱۸-۰۰
۸۔ توضیحات :	۱۲-۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس : جلد اوّل	۲۷-۰۰
: جلد دوم	(زیرِ طبع)
۱۰۔ اصولِ تدبرِ حدیث :	(〃)
۱۱۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار :	(〃)
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام :	(〃)
۱۳۔ حقیقتِ شرک و توحید :	(〃)
۱۴۔ حقیقتِ نماز :	(〃)
۱۵۔ حقیقتِ تقویٰ :	(〃)

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروزپور روڈ، اچھرہ، لاہور ۱۶ (پاکستان) فون : ۴۱۰۸۴۹